دھوپ سنوارے
(افسانوں کا مجموعہ)
سلیم سرفراز

دھوپ سنوارے

(افسانوں کا مجموعہ)

سلیم سرفراز

کتاب : دھوپ سنوارے
مصنف : سلیم سرفراز
مطبع : نیو انڈیا آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔
کمپوزنگ : ایم ٹی ٹیک کمپوٹر پرنٹرس (محمد انور)، جہانگیری محلّہ، آسنسول
ناشر : ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی
10 میٹروپول مارکیٹ، 25-2724 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔

DHOOP SANWAAREY

(A collection of short stories)

By : **SALEEM SARFARAZ**
J.N. Pharmacy, K.T. Road, Asansol-2
Mob. : 09378291891

ISBN: 978-93-80934-74-7

Edition : 2012
Price: **Rs.200/-**
Library Editon: Rs. 295/-

Printed & Published by

M. R. PUBLICATIONS

Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books

#10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910
E-mail: abdus26@hotmail.com

اپنے مرحوم بھائیوں

عبدالحلیم

اور

محمد نسیم

کی نذر

سفر سفر حیات کو جو دے رہا تھا راحتیں
وہ ایک ٹکڑا ابر کا نہ جانے اب کدھر گیا

(سلیم سرفراز)

سلیم سرفراز......ایک تعارف

نام	:	محمد سلیم
قلمی نام	:	سلیم سرفراز
والدین	:	عبدالسبحان مرحوم، روشن آرا
جائے پیدائش	:	آسنسول، مغربی بنگال
تعلیم	:	گریجویشن
پیشہ	:	تجارت
تصانیف	:	خواب کنارے (افسانے)
		یادسہارے (افسانے)
اعزاز	:	خواب کنارے، بہار اردو اکادمی سے انعام یافتہ
مستقل پتہ	:	جے۔این۔فارمیسی، کے۔ٹی۔روڈ، ریل پار، آسنسول پن کوڈ۔ ۷۱۳۳۰۲ (مغربی بنگال)

کتاب ملنے کے پتے

تسلیم بک ڈپو، بسٹن بازار، آسنسول۔۱

نشاط بک ڈپو، نیو سینما موڑ، آسنسول۔۱

حنفی بک ڈپو، کے۔ٹی۔روڈ، آسنسول۔۲

انتساب

معتبر اور استاد شاعر تسلیم نیازیؔ

جو علمی صلاحیت، فکری بلاغت، فنی مہارت اور تنقیدی بصیرت کے

چہار دریچہ ہیں

اور

پیکر جاہ و جمال، صاحب ہنر و کمال

جلال کاکوی

کے نام

فہرست

حمد

خنداں سحر کی ساعت تنویر بھی تری
تاریک و مضمحل شب دلگیر بھی تری

بس تیرا حکم پاتے ہی سب چھوڑ جائیں گے
ارضِ بدن بھی تیرا ہے، تعمیر بھی تری

ہم نے اتار دی ہے جو دستار، تیری تھی
غیروں کو جو ملی ہے وہ توقیر بھی تری

چشم سلیم تیری عطا کردہ اے خدا
اس میں ترے ہی خواب، تعبیر بھی تری

اپنی بات

'خواب کنارے' اور 'یاد سہارے' کے بعد میرا تیسرا افسانوی مجموعہ ''دھوپ سنوارے''
اشاعت کے سخت مراحل سے گزر کر محترم قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔ اس درمیانی وقفے میں
جہاں اور زندگی میں ڈھیر ساری تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں جنہوں نے براہ راست یا بالواسطہ
ذہن و دل کو متاثر کیا ہے۔ حساس ہونے کی اپنی اذیتیں ہوتی ہیں۔ کسی بھی تغیر کو ذہن آسانی سے
قبول نہیں کرتا اور نہ ہی کسی لذت سے مکمل آزادی و بے فکری کے ساتھ ہم کنار ہوا جا سکتا ہے۔ ہر
ظاہر میں باطن کے خدوخال ابھر آتے ہیں جو کہ بہت دلکش اور پر کشش نہیں ہوتے۔ ہر حصولیابی میں
محرومی کے خدشات مخفی ہوتے ہیں جو اس سے حظ کشید کرنے میں مانع ہوتے ہیں پندرہ بیس سالوں
میں جو تغیرات رونما ہوئے ہیں اور دنیا سمٹ کر جس طرح ماچس کی ڈبیا میں سما گئی ہے انسان ان سے
متحیر ہونے کے ساتھ متفکر بھی ہوا ہے۔ کوئی بھی نئی ایجاد یا دریافت انسانی جذبات اور تصورات کو
مجروح کرتی ہے اور صدیوں سے جن بنیادوں پر انسانی وجود قائم رہا ہے۔ انہیں متزلزل کر دیتی
ہے۔ انسان اندر سے کمزور اور خوفزدہ ہوتا جاتا ہے اور اسے اپنی بقا کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے جس
کے نتیجے میں وہ جارح اور متشدد ہوتا جاتا ہے۔ ہر فرد کے اپنے اعتقادات اور تعصبات ہوتے ہیں
جن کے زیر سایہ وہ حیات کی منازل طے کرتا ہے اور ان میں رخنہ اندازی برداشت نہیں کر پاتا۔ آج
بم ہو کہ قلم مسلسل انہیں ہی ضرب پہنچا رہے ہیں، اس کلیے سے دانستہ بے پروا کہ ہر عمل کا رد عمل ہوتا
ہے۔ تیز رفتار ترقی و تبدیلی کی اس دوڑ میں حاشئے پر رہ جانے والے کہنہ اقدار کے پاسدار لوگ دیر
تک خاموش تماشائی نہیں رہ سکتے۔ انہیں اپنی بقا کے لیے مزاحمت کرنی ہی ہے اور یہ مزاحمت ایک
طویل اور فیصلہ کن جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس وقت تمام عالم بالکل نامحسوس طریقے

سے عیار تاجروں کے شکنجے میں پھنستا جا رہا ہے۔ دھمکی، دھوکہ یا دھما کہ جہاں جو اسلحہ کارگر ہو، بے خطر و بے دریغ آزمایا جا رہا ہے۔ ہزاروں سال کی سنہری تاریخ اور زریں تہذیب وتمدن رکھنے والی قوموں پر ایک ایسی قوم کی جانب سے یلغار ہے جس کی اپنی کوئی تاریخ ہے اور نہ تہذیب وتمدن، وہ بھان متی کے کنبے کے بل پر نہایت رعونت سے فرمان جاری کرتی ہے کہ جو اس کے ہمراہ نہیں وہ گمراہ ہے۔ جو اس کی خود ساختہ تہذیب وتمدن کا مقلد نہیں وہ غیر مہذب ہے۔ اس سے زیادہ اس کے حاشیہ بردار متحرک اور مشتعل ہیں۔ ان استعماری قوتوں سے متصادم مخالف قوتیں اپنے احمقانہ اور ناعاقبت اندیشانہ طرز عمل سے انہیں کے مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔

ان حالات میں عوام دوست اور حق پرست فن کار کے شانوں پر دہری ذمہ داری آپڑی ہے۔ انہیں ہر دو محاذ پر نبرد آزما ہو کر اس لازمی جدوجہد کو صحیح سمت دینی ہے۔ ایک طرف ہر لمحہ تیزی سے بدلتے ہوئے ضرر رساں افکار و اقدار ہیں تو دوسری طرف صدیوں سے جامد اور زنگ خوردہ نظریات و اعتقادات جن کے درمیان سیدھے سادے معصوم افراد جینے کی تگ و دو میں مرتے جا رہے ہیں۔ ہر فنکار کی جڑیں زمین میں پیوست ہوتی ہیں اور اس زمین پر ہونے والے تمام ظلم و جبر اس پر اثر انداز ہوتے ہیں جو اس کے تخلیقی ثمر میں داخل ہو جاتے ہیں فنکار بنیادی طور پر صالح اقدار کا حامی اور کہنہ روایات کا حریف ہوتا ہے۔ ظلم و ناانصافی انفرادی سطح پر ہو کہ اجتماعی سطح پر، اس کے خلاف احتجاج اس کی فنی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کے احتجاج سے کوئی انقلابی تبدیلی رونما ہو یا صدیوں سے ہو رہے جبر و استبداد یکلخت ختم ہو کر فضا میں امن و انصاف کی روپہلی چادر تن جائے لیکن وہ اپنے فنی فریضے سے یقیناً سبکدوش ہو جاتا ہے۔

زیر نظر افسانوی مجموعے میں ان افسانوں کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو عصر حاضر کے خونچکاں واقعات اور ذہن و دل پر کچوکے لگانے والے حادثات سے زخم خوردہ ہو کر رعشہ زدہ قلم سے تحریر کیے گئے ہیں۔ اس طرح کے افسانوں کے اپنے خطرات اور خدشات ہوتے ہیں۔ ذرا سی لغزش افسانہ نگاری کو واقعہ نگاری میں تبدیل کر دیتی ہے تمام احتیاط کے باوجود موضوعات کے پیش نظر کچھ افسانوں میں خطابت کا رنگ غالب ہے۔ ہر چند کہ افسانے کے لیے یہ مستحسن رنگ نہیں

لیکن اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کے لیے کبھی کبھی مجھے یہی طرز نگارش موزوں لگا پھر بھی میں نے افسانویت قائم رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔اس مجموعے میں چند بالکل تازہ افسانے ہیں تو چند عرصہ قبل تخلیق میں آئے وہ افسانے ہیں جن پر بوسیدگی اور فرسودگی کی گرد نہیں چڑھی ہے۔ان میں سے دو ایک کا اظہار پیرایہ علامتی و استعاراتی ہے تو بیشتر راست بیانیہ میں تحریر کیے گئے ہیں۔ان افسانوں کے بطن میں موجود نظریات و خیالات سے کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان میں مخفی خلوص و ایمانداری سے شاید ہی کسی کو انکار ہو۔ میں ایک مسلم گھرانے میں پیدا ہوا اور اپنی بہت ساری کوتاہیوں کے باوجود دین اسلام پر ایمان رکھتا ہوں اور اس کے داعی حضرت محمد ﷺ کو کائنات کی عظیم ترین اور مقدس ترین شخصیت تسلیم کرتا ہوں اور ان سے عقیدت و محبت کو جزو ایمان اور حاصل زیست تصور کرتا ہوں۔ بنیادی طور پر میں عشق کی روایت کہنہ کا پاسدار ہوں اور محبوب سے منسوب ہر شئے اور فرد کو اپنے دل کے بے حد قریب پاتا ہوں۔میری فہم سے بالاتر ہے کہ کوئی فرد کسی کے عشق کی دعویٰ داری کے باوجود اس سے متعلق افراد اور یادگار سے متنفر کس طرح ہوسکتا ہے اور اپنے قول و فعل سے اس کی شخصیت کو مسخ کرنے کی گستاخی کس طرح کرسکتا ہے۔میرے عقیدے کی روشنی میں ہم مسلمانوں کے لیے قابل تقلید صرف اور صرف سرور کونین ؐ کی ذات اقدس ہے۔ دیگر کوئی بھی باوقار اور معتبر شخصیت قابل فخر و تعظیم تو ہوسکتی ہے قابل تقلید نہیں۔سیرت النبیؐ سارے عالم کے لیے وہ بے مثال اور روشن نمونہ ہے کہ جس سے بلاتفریق دین و مذہب مستفیض ہوکر حیات انسانی کو پرنور اور پرامن بنایا جاسکتا ہے۔لیکن صد حیف کہ ان کے نام لیوا ہی ان کی سیرت حسنہ کو فراموش کر بیٹھے۔ عربوں کے قبائلی اور نسلی افتخار جو نبی کریمؐ کی حیات مبارکہ کے زیر اثر کسی حد تک مفقود ہو چکے تھے ان کے وصال کے بعد ایک بار پھر ان میں عود کر آئے اور قبائلی برتری اور حکمرانی حاصل کرنے کی مسلح جدوجہد میں مسلم خون کی جو ارزانی شروع ہوئی وہ تا حال جاری ہے۔ پوری تاریخ انسانی میں یہ عبرت انگیز نظیر نہیں ملے گی کہ کسی پیغمبر کی امتیوں نے ان کی محبت و اطاعت کا دعویٰ کرتے ہوئے ان کے خاندان کے بے حد عزیز مقدس اور معصوم افراد کو قریب دریا تشنہ لب رکھ کے تہہ تیغ کرنے کے بعد نیزوں پر ان کے سروں کا جلوس فتح نکالا ہو اور ان کی خواتین کو اسیر کر کے مال غنیمت کے طور میں

دربار شاہی میں لایا ہو۔ کیا یہ مذموم اور ظالمانہ فعل صرف اپنی حکمرانی کو برقرار رکھنے اور اسے اعتبار بخشنے کے لیے انجام دیا گیا تھا؟ کیا اس عمل میں برسوں سے دلوں میں پرورش پا رہے وہ بغض و کینہ اور احساس شکست کا کرب کارفرما نہیں جو اعلان نبوت کے بعد عروج دین کے ساتھ عرب کے بیشتر قبائل میں پیدا ہوتے گئے تھے؟ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے حالات میں کچھ بے وقوف لوگ براہ راست مخالفت پر اتر آتے ہیں اور قدرے شاطر افراد بظاہر فاتح کے ساتھ ہو لیتے ہیں لیکن بباطن اس کی جڑیں کاٹنے میں مصروف رہتے ہیں۔

دنیا سرائے فانی سہی لیکن اس میں ٹھہرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ اسے آئندہ کے مسافروں کے لیے بہتر اور آرام دہ بناتے رہا جائے اور فن کار تو کچھ زیادہ ہی ذمہ دار ہوتا ہے۔ فن کار ہوا میں معلق نہیں ہوتا۔ وہ بھی زمیں پر رہتے ہوئے زمین کے مسائل کے روبرو ہوتا ہے۔ اور انہیں کچھ زیادہ ہی محسوس کرتے ہوئے فنی ریاضت اور مہارت کے ساتھ دوسروں پر آشکار کرتا ہے۔ اب اس کی صلاحیت جیسی ہو لیکن ایمانداری شرط ہے۔ اس مجموعے میں شامل افسانے اس بنیادی شرط پر پورے اترتے ہیں یا نہیں، اس کا فیصلہ تو قارئین کی عدالت میں ہی ہوگا اور اس فیصلے کا احترام مجھ پر لازم ہے۔

پے در پے دلدوز سانحوں کی وجہ سے میں عرصہ تک ادب سے تقریباً کنارہ کش رہا۔ واپسی ہوئی تو مناظر قدرے تبدیل ہو چکے تھے اور میری ادبی شناخت بھی کہیں گم ہو چکی تھی۔ نئے سرے سے ادبی سفر شروع کرنے میں تھوڑی جھجھک ہوئی لیکن میں شکرگزار ہوں معتبر اور بزرگ ادیب نذیر احمد یوسفی کا جو مکمل اختیار و التفات کے ساتھ مجھے مہمیز کرتے رہے۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی ہے کہ خود ایک کہنہ مشق ادیب ہونے کے باوجود میری تحریروں کی پذیرائی کرتے رہے۔ جس کا ثبوت اس کتاب میں شامل ان کا گراں قدر مضمون ہے۔ میں مستند اور استاد شاعر تسلیم نیازی کا بھی ممنون ہوں کہ وہ میری تخلیقات کی خوبی و خامی سے مجھے آگاہ کرتے رہے۔ میں ان کی ادبی و تنقیدی صلاحیت کا معترف ہوں۔ ہر چند کہ وہ عمر میں کم ہیں لیکن میں نے ان کی جیسی باکمال اور شعری و تنقیدی شعور سے مالا مال شخصیت کم ہی دیکھی ہیں۔ وہ صنف شاعری کے استاد ہیں لیکن افسانوی فن

پر بھی ان کی گہری نگاہ ہے اور اس سے متعلق ان کی بے لاگ رائے کو میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

آخر میں اپنے چھوٹے بھائی ندیم صادق کو میں دعا دینا چاہوں گا جو میری ادبی کاوشوں کا خاموش مداح ہے اور خود بھی صنف شاعری سے شغف رکھتا ہے۔ اس مجموعے کی اشاعت میں اس کی آرزو اور تگ و دو کا بڑا دخل ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ سفر حیات کے ہر موڑ سے کامیاب و کامران گزرے۔ آمین۔

محترم قارئین سے گزارش ہے کہ مجموعے کے مطالعے کے بعد اس کی خوبیوں اور خامیوں سے مجھے مطلع فرمائیں تا کہ ان کی آرا کی روشنی میں اپنا ادبی سفر زیادہ اعتماد اور یقین کے ساتھ جاری رکھ سکوں۔

طالب دعا
سلیم سرفراز

☆☆☆☆☆

سازِ دل کی زخمی آواز- سلیم سرفراز

نذیر احمد یوسفی

سلیم سرفراز افسانوی ادب میں نو مشق اور نو وارد نہیں ہیں۔ انہوں نے دو دہائی سے زائد عرصہ اس دشت کی سیاحی میں گزارا ہے۔ اپنے پہلے ہی افسانے ''سر کٹے لوگ'' مطبوعہ انشاء کولکاتہ سے انہوں نے جو تابناک نقش قائم کیا تھا، وقت کے ساتھ اس میں بتدریج گہرائی اور پختگی ہی آئی ہے۔ اس دوران انہوں نے متنوع اور فکر انگیز موضوعات کو افسانوی پیکر عطا کیا ہے۔ ایک حساس اور بیدار ذہن فنکار ہونے کے ناطے حالات حاضرہ پر ان کی گہری نگاہ رہتی ہے جن کا وہ اپنے طور پر تجزیہ کرتے رہتے ہیں اور پھر اس کے باطن سے کوئی اچھوتا اور منفرد موضوع نکال لاتے ہیں جسے اپنے پرزور بیانیہ کی مدد سے کردار و واقعات کی موثر تشکیل کے ساتھ دلکش نثر میں پرو کر وہ افسانہ تخلیق کر دیتے ہیں جس کی سحر آفرینی سے مفر ممکن نہیں۔ ماضی قریب میں سر زمین بنگال کے ایک گاؤں میں پیش آنے والے سانحے پر دوسری زبان کے بیشتر قلم کاروں کے ساتھ میرے خیال میں وہ اردو کے واحد قلم کار ہیں جنہوں نے اپنی دو بے حد پر اثر اور یادگار، کہانیوں

'اپنی زمیں، اپنی ماں' اور وہ ''مکمل نہیں مرتے'' کے ذریعہ احتجاج درج کرایا تھا۔ ''اپنی زمین، اپنی ماں'' کا اقتباس ملاحظ ہو۔

''وہ ناریل کے چکنے تنے میں اپنے بازو حمائل کرتی ہوئی ہیجانی کیفیت میں چیخی۔

''آمرا کینو چھاڑبو؟ آما دیر گرام آچھے۔ کے چھاڑیئے دیبے؟ (ہم کیوں چھوڑیں گے؟ یہ ہمارا گاؤں ہے۔ کون چھڑائے گا؟)

شمس الدین نے اسے راجا اور پرجا کے درمیان واقع صدیوں پرانے فرق کو سمجھانا چاہا۔ اسے بتانا چاہا کہ زمین سے جڑے مسائل بھی خلا میں معلق ائر کنڈیشنڈ دفتروں میں ہی حل کیے جاتے

ہیں۔ان کے ایک ہوائی فیصلے سے ہزاروں افراد اپنی جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں اور انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔کاغذ پر پنسل سے لکیریں کھینچتے رہنے والوں کے لیے انسانی وجود بھی انہیں لکیروں کی طرح ہے جسے جب چاہیں ایریزر سے مٹا ڈالیں۔ان کے یخ بستہ پتھریلے کمروں میں زمین کی نرمی اور انسانی جذبات کی گرمی کہاں؟ان کمروں میں رہائش پذیر لوگ بھی شاید سرد پتھر میں ہی تبدیل ہو جاتے ہیں''۔

خارجی اور ہنگامی واقعات ان کی تخلیقات کے موجب تو بنتے ہیں لیکن تخلیقیت کے پر اسرار مراحل سے گزرتے ہوئے ان کے افسانے محض راست بیانی کے بے جان نمونے نہیں رہ جاتے بلکہ فنی ہنرمندی اور تخلیقی مشاقی سے ایسے مرقعے میں تبدیل ہو جاتے ہیں جن میں رمز و کنایہ، علامت و استعارے کا ایک جہاں تحیر و تجسس آباد ہوتا ہے جن باشعور قارئین کی نکتہ شناس نگاہوں سے ان کے افسانوی مجموعے ''خواب کنارے'' اور دوسرے افسانے گزرے ہیں انہیں بخوبی ادراک ہوگا کہ وہ اس راہ شوق سے گزرنے والے بند آنکھوں اور جامد ذہن کے عجلت پسند مسافر نہیں بلکہ ایسے سنجیدہ سیاح ہیں جو راہ کے پیچ و خم، نشیب و فراز، شجر و حجر یہاں تک کہ سنگ و خشت سے بھی آشنائی قائم کر لیتے ہیں۔وہ جہاں سے سرسری نہیں گزرتے بلکہ ہر منظر سے ہم آہنگ ہو کر اس کے تمام رنگ و بو کو جذب کرتے ہوئے اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔

ان کا قلم صرف قومی اور عالمی مسائل کے دائرے میں ہی نہیں گردش کرتا بلکہ فرد کی حسیات و نفسیات، انسانی رشتوں کی تقدس و پامالی، اعلیٰ اقدار کی شکست و ریخت، ذہن و دل کی بیداری و بے حسی بھی ان کے افسانوں کے نمایاں جز بنتے ہیں۔

ان کا ایک اہم افسانہ ''دلکشی پور کی شریفن'' میں رنڈیوں کے حوالے سے ملکی اور عالمی سطح پر ہونے والی تیز رفتار ترقی و تغیر زوال آمادہ اخلاق و کردار، مادہ پرستی کی اندھی دوڑ، بازار واد کا غلبہ، اشتہار زدہ سماج کے مصنوعی حسین چہرے اور ان کے پیچھے پوشیدہ کریہہ المنظر اور زرگزیدہ جھریوں کو اس طرح تخلیقی پیکر میں ڈھالا گیا ہے کہ دل و دماغ اس کی گرفت سے جلد رہائی نہیں پا سکتے۔اس افسانے کے چند اقتباس ملاحظ ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ افسانہ نگار کو بیانیے پر کتنی دسترس حاصل

ہے اور کردار سازی و مکالمہ نگاری میں کس قدر مہارت ہے۔

''ٹی۔وی پروگراموں کے ذریعہ لوگوں کو ایک مصنوعی دنیا اور تہذیب سے متعارف کرایا جا رہا تھا اور ان میں دکھائے جانے والے اشتہاروں میں چیزوں کی اصلیت کہیں گم کر دی گئی تھی۔ اشتہاری دباؤ کے تحت مٹی سونے کے نرخ پر فروخت ہو رہی تھی اور ''اس کی ساری میری ساری سے سفید کیوں''، کے سوال کو حل کرنے کی کوشش میں ہر چہرہ سیاہ پڑتا جا رہا تھا۔ پردۂ سیمیں کا باغی نوجوان ادھیڑ عمری میں چھوٹے پردے پر ''کون بنے گا کڑوڑ پتی کے ذریعہ نئی نسل کو جوئے کی ترغیب دینے لگا تھا اور کرکٹ کے ہیرو سٹے بازوں سے ملک کے وقار کا سودا کرنے لگے تھے''۔

ایسا نہیں کہ یہی ایک افسانہ سلیم سرفراز کی فنی اور فکری بلندیوں کا پتہ دیتا ہے۔ان کے بیشتر افسانے ان خوبیوں سے مزین ہیں جو افسانے کو معیاری اور یادگار بنانے میں معاون ہوتی ہیں ۔ان کا فن مسلسل ارتقائی عمل سے گزر رہا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں کے اسلوب میں کسی قسم کی پابندی قبول نہیں کی ہے۔وہ صرف اور صرف 'کہانی پن' کے متلاشی ہیں۔انہیں جدیدیت سے گریز ہے اور نہ ترقی پسندیت سے پرخاش۔مذکورہ بالا افسانہ اگر موجودہ اصطلاح میں مابعد جدیدیت کے زمرے میں آتا ہے تو ان کی کچھ کہانیوں کو جدیدیت کے خانے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ان کا افسانہ ''آگہی'' علامت نگاری کی عمدہ مثال ہے جس میں انسانی ہاتھ کے انگوٹھوں کے توسط سے قومی محرومی اور بیرونی ازالے کی بامعنی تصویر کشی بے حد فنی مہارت اور ذہانت سے کی گئی ہے۔ بیشتر علامتی افسانوں کے برعکس اس کی ترسیل و تفہیم میں قطعی دشواری نہیں ہوتی اور ذہین قاری افسانے کے باطن میں اتر کر ایک انوکھا حظ کشید کرتا ہے لیکن جلد ہی افسانے کے المیے کو محسوس کر کے افسردہ ہو جاتا ہے۔افسانہ نگار کا کمال فن ہے کہ کوزے میں دریا بند ہو گیا ہے۔یہ کثیرالجہتی و کثیرالمعنی افسانہ ثابت کرتا ہے کہ فن کار کا وژن کس قدر بھرپور ہے۔اپنے افسانے ''آگہی'' کے ذریعہ انہوں نے ملک کے ارباب اقتدار کو تھوڑے سے فائدے کے عوض آئندہ پیش آنے والے ممکنہ خطرے سے آگاہ کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے۔

سلیم سرفراز صالح اقدار کے پاسدار، اخوت و محبت کے متلاشی اور کسی بھی طرح کی انتہا

پسندی سے بیزار وہ معتبر اور منفرد فن کار ہیں جنہیں ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا۔ بس کار جنوں میں خود کو مصروف رکھنا ہی ان کا مقصد حیات ہے کہ روح و قلب میں اٹھنے والی اجتماعی لہروں کو نکاسی کا راستہ نہ ملے تو لہو سرد پڑ جاتا ہے۔ احتجاج ان کے افسانوں کا غالب رنگ ہے۔ ظالم و ریاکار کسی بھی خوشنما اور مقدس لباس میں کیوں نہ ہوں، ان کی مخالفت وہ قلمی فریضہ سمجھتے ہیں۔ 'کالا قانون' اور 'وہ بچے ہی تھے' جیسے افسانوں میں وہ ملک میں قانون نافذ کرنے والوں کو اپنے قلم سے برہنہ کرتے ہیں تو اپنے تازہ افسانہ ''ہانکا کرنے والے'' میں نام نہاد ان مجاہدوں کو ہدف تنقید بناتے ہیں جو مذہب کے نام پر دہشت گردی پھیلا کر مذہب اور قوم دونوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔

انہوں نے نہ صرف اجتماعی طور پر متاثر کرنے والی صورت حال پر بامعنی اور بامقصد کہانیاں تحریر کی ہیں بلکہ انفرادی طور پر حیات انسانی کے کرب والم، رنج و غم، محرومی و تشنگی اور ذہنی کشمکش و بدنی جدو جہد کو بھی اپنے تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اجال کر صفحہ قرطاس پر مکمل محویت اور خلوص کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کے تخیل کی پرواز افسانوی افق پر بے حد متوازن اور مستحکم ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں نہ علمیت کے کروفر دکھا کر عام قاری کو مرعوب کرنے کا جتن کرتے ہیں اور نہ ہی غیر ضروری عناصر و مناظر کو پینٹ کر کے مشاہدے کی دھونس جماتے ہیں۔ وہ افسانے کے فن اور اس کے رموز و اسرار سے کماحقہ واقف ہیں اس لیے ان کا قلم اپنے محور پر ہی گھومتا ہے۔ ان کے قدرے طویل افسانوں سے بھی کسی ایک جملے کو زائد قرار دے کر نکالنا مشکل ہے جو اس امر کا غماز ہے کہ وہ ہر ایک جملے پر غور و فکر اور محنت کرتے ہیں اور اسے کہانی کے اصل موضوع میں اس طرح مدغم کر دیتے ہیں کہ اس کی علاحدہ شناخت ممکن نہیں ہوتی۔ ان کی کہانیاں اس طرح سجی سنوری اور مکمل ہوتی ہیں کہ نفاست اور ریاضت سے تراشے گئے شجر گل کا گماں ہوتا ہے۔ ان کی کہانیاں کوہستانی جھرنے کی طرح فراز سے نشیب کی جانب اترتی ہیں اور جب وہ آخر میں نشیبی سطح سے ٹکراتی ہیں تو ایک تیز ارتعاش پیدا ہوتا ہے اور یہی ارتعاش قارئین کے دل و دماغ کو روشن کر دیتا ہے اور ان پر کہانی کے تمام اسرار منکشف ہو جاتے ہیں۔

ان کے متنوع اور رنگا رنگ افسانوی جہاں کی سیر ایک پر لطف اور فکر انگیز تجربہ ہے۔ ان کا

ہر افسانہ ایک نئے تناظر میں الگ زاویے سے ذات و کائنات سے روشناس کراتا ہے۔ ان کے ایک افسانے ''برسات کی چاندنی'' میں اقوام متحدہ کی بے عملی ولاچاری اور بڑی طاقتوں کی ریاکاری و دوغلی پالیسی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ طاقتیں اقوام متحدہ کو یرغمال اور آلہ کار بنا کر اپنے مفاد اور بالادستی کی خاطر کمزور اور خانہ جنگی کے شکار ملک میں امن و امان قائم کرنے کے نام پر غیر انسانی اور انتہائی متعصبانہ کھیل کھیلتی ہیں۔ یہ افسانہ بین الاقوامی سطح پر ہونے والے سنگین جرائم کے خلاف فن کارانہ طریقے سے موثر آواز بلند کرتا ہے تو 'آنگن کی دیوار' نامی افسانہ دو بھائیوں کے درمیان آبائی مکان کے بٹوارے کے لیے آنگن میں دیوار اٹھانے کے اذیت ناک اور کرب انگیز عمل پر بے حد جذباتی انداز میں احتجاج درج کراتا ہے۔ ایک افسانہ عالمی سیاق و سباق میں ملک و قوم کی تقدیر رقم کرنے والے با اثر اور با اختیار افراد کا گریبان پکڑتا ہے تو دوسرا بالکل مقامی سطح پر درون خانہ جذبات و احساسات کے مجروح ہونے اور انہیں پوری طرح مرنے سے بچانے کی تگ و دو کو بیاں کرتا ہے۔ دونوں افسانے دو مختلف پس منظر پر مبنی مکان و زمان اور موضوع کے لحاظ سے بالکل علاحدہ افسانے ہیں لیکن دونوں میں قدر مشترک کی شکل میں انسانی رشتوں کی تقدیس و عظمت کی بقا کے لیے سچی اور ایماندارانہ تڑپ موجود ہے۔

اور یہی تڑپ ان کے تمام افسانوں کا جزو لاینفک ہے۔ موضوع کوئی ہو اور گفتگو کسی بھی تناظر میں ہو، ان کے افسانوں کا بنیادی اور قیمتی جوہر صالح اقدار کا پاس و لحاظ اور محبت و اخوت کی تبلیغ ہے۔ انہوں نے کچھ افسانوں میں انسانی ذہن کی پیچیدگی اور پر اسراریت کی نفسیاتی عکاسی کرنے کی دلچسپ اور کامیاب کوشش کی ہے۔ مثلاً ''زندہ مگر شرمندہ'' میں شخصیت کے ذہنی طور پر دولخت ہو جانے اور ''حریف'' میں خیالی دشمن تخلیق کر لینے کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ دونوں افسانے اپنے موضوع اور پیش کش کے اعتبار سے اچھوتے اور ذہن و دل کو مسخر کرنے والے ہیں۔ دونوں افسانوں کے بالکل آخر میں انکشاف ہوتا ہے کہ بظاہر نارمل نظر آنے والے کردار کس قدر پیچیدہ اور گہرے نفسیاتی امراض میں مبتلا ہیں۔

وہ اپنے خیالات اور نظریات کی روشنی میں بے حد وطن پرست ہیں اس لیے مادر وطن کے

جسم و روح پر کوئی بھی زخم دیکھتے ہیں تو مضطرب ہو جاتے ہیں اور اسے مندمل کرنے کے لیے عمل جراحی سے کام لیتے ہیں جو سرسری نگاہ سے بہت سفاک اور بے رحم دکھائی دیتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر آشکار ہوتا ہے کہ اس عمل جراحی میں کتنی دردمندی اور خلوص و محبت کا عنصر شامل ہے۔ ان کے افسانے ''سعی لاحاصل'' اور ''رام غلام کی واپسی'' میں ملک کی آزادی کے بعد خوابوں کے ٹوٹنے اور آرزوؤں کے پامال ہونے کا کرب جھلکتا ہے کیونکہ حصول آزادی کے باوجود حالات میں کوئی نمایاں اور خوشگوار تبدیلی نہیں آتی بلکہ ملک ایک خودغرض اور ظالم کے شکنجے سے نکل کر اس دوسرے کی گرفت میں آجاتا ہے جو اپنا ہونے کے باوجود پہلے سے کچھ زیادہ ہی مفاد پرست اور عوام دشمن ہے۔ ''سعی لاحاصل'' کا یہ کرب ملاحظ ہو۔

''دھوکے باز!...... کمینے......! ہم نے تو انہیں اپنا سمجھا تھا...... لیکن سب کے سب سالے دشمنوں سے مل گئے۔''

وہ یک لخت اٹھ کھڑا ہوا۔ کھونٹی سے زرہ بکتر اتارا اور جسم پر چڑھانے لگا۔

''کیوں بابو؟ پھر کہیں جانے کا ارادہ ہے؟

''تم نے اعلان نہیں سنا...... پھر وہی حکم...... حاکم بدل گیا لیکن سالا حکم نہیں بدلا......''

وہ محض تفریح طبع اور نام و نمود کی خاطر افسانے تخلیق نہیں کرتے۔ وہ بے حد سنجیدہ اور جہاں دیدہ افسانہ نگار ہیں جن کی نگاہ میں افسانہ ایک ایسی شمشیر برہنہ ہے جو جسم کی بجائے روح پر کاری زخم پہنچاتا ہے۔ مادر وطن کے ساتھ انہوں نے اپنے افسانوں میں ماں کے درد کو بھی نہایت حساس فن کاری سے اجاگر کیا ہے۔ ''مشتری ہوشیار باش' اور ''نم زمین کو روندتے پاؤں'' میں اولاد کی ناخلفی اور خودغرضی کے ساتھ ماں کی ممتا اور بے لوث محبت کی جس ہنرمندی اور باریکی سے عکاسی کی گئی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ دونوں افسانے اتنے غم انگیز اور دل سوختہ ہیں کہ قاری دیر تک حزن و یاس کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے۔ ''مشتری ہوشیار باش'' کے اس دلدوز اقتباس کو دیکھیں۔

''میں نے شدید کرب اور حسرت سے اس مغموم اور بے بس ماں کو دیکھا جس کے دونوں بیٹے اسے تنہا چھوڑ گئے تھے۔ کیا لوگ مستقبل کی تعمیر میں ماضی کی بنیاد کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں۔

میرے تصور میں بیتے ہوئے کل کے وہ تمام حصے جھلکنے لگے جس میں انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کی بہتر پرورش و پرداخت میں اپنی بے لوث محبت اور توجہ کا ایک ایک لمحہ لگایا تھا۔ لیکن بدلے میں انہیں کیا ملا؟ ایک ایسا بوجھل اور گھنی تنہائی کا جنگل جس میں یادوں کے قافلے بھی پاؤں رکھتے ہوئے جھجھکتے ہوں گے''۔

سلیم سرفراز کے قلم نے زندگی اور اس سے منسلک رشتوں اور جذبوں کی ہر ایک شکل کو مصورانہ مشاقی سے کاغذ پر پینٹ کیا ہے۔ افسانہ ''پشت پر سوار بیٹا'' میں بیٹے کے تئیں باپ کی محبت کا نقطہ عروج پیش کیا گیا ہے۔ جس میں بیٹے کی بیگانگی اور سرد مہری سے دلبر داشتہ ہو کر باپ اس کی خوشیوں کے واسطے خود کو موت کے حوالے کر دیتا ہے تو دوسری طرف افسانہ ''خشک زمین پر بارش'' میں جواں سال بیٹے کی ناگہانی موت پر درد و غم میں ڈوبے ہوئے باپ کو شریک غم کے روپ میں بیٹے کی محبوبہ ملتی ہے تو اس میں از سر نو جینے کی امنگ اور توانائی پیدا ہو جاتی ہے اور اسے ادراک ہوتا ہے کہ رشتے جذبوں سے بھی تشکیل پاتے ہیں جو کہ کم پائیدار اور عزیز نہیں ہوتے۔

وہ انسانی رشتوں اور جذبوں کے بہترین نباض ہیں اور اپنے قلم کے ذریعہ ان کی صورت گری کرنے میں انہیں خاصی مہارت حاصل ہے۔ وہ عصر حاضر کے بے حس اور مسخ صورت سماج میں ان اعلیٰ انسانی قدروں کے نوحہ گر ہیں جن سے حیات بامعنی اور با مقصد نظر آتی ہے اور اس میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ ان کا گریہ سماعت سے ٹکرا کر دل تک پہنچتا ہے تو رگوں میں ڈورتا ہوا لہو جذبے کی شدت اور حدت سے پگھل کر آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے۔ ان کے یہاں افسانہ نگاری کو عبادت کا درجہ حاصل ہے جس میں تقدیس و پاکیزگی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ جوان العمر ہونے کے باوجود ان کے افسانوں میں جذباتی رومانیت کا غلبہ ہے اور نہ جنسی عمل و دخل کا فحش بیان۔ حالانکہ جنسی عمل ایک فطری اور بنیادی انسانی ضرورت ہے لیکن اس کے بے باکانہ اظہار سے انہوں نے حتی الامکان دامن بچانے کی دانستاً کوشش کی ہے جبکہ بعض افسانہ نگار اس کے بیان میں اعتدال کی حد سے گزر جاتے ہیں۔ انہیں افسانے کی ضرورت کے تحت جنس کی شمولیت سے احتراز نہیں لیکن فیشن کے طور پر بلا ضرورت اسے برتنا گوارا نہیں۔ افسانہ ''پہلے کیوں نہیں'' میں جنسی عمل کے بیان کی پردہ داری ملاحظ ہو۔

''میں مبہوت اور مسحور سا ان کی نرم مخروطی انگلیوں کو اپنے سینے پر رینگتی ہوئی محسوس کرتا رہا۔ قمیض اتری تو جیسے ان کی شخصیت پر چڑھی ہوئی ہر پرت اتر گئی۔ میرے سامنے عظمت و حرمت کی مورت سلمیٰ بیگم کی جگہ پر اب ایک ایسی عورت موجود تھی جس کے روم روم سے گہری تشنگی ٹپک رہی تھی۔ ان پر ایک وحشت سی طاری ہوگئی اور ان کی گداز بانہوں کی لذت انگیز گرفت میں میرے حواس معطل ہوگئے۔ ان کی سپردگی میں ایسی جارحیت تھی کہ میں بالکل بے بس ہوگیا۔ اور پھر ان کے اندر سے تمام بندوں کو توڑتا ہوا ایک پرشور اور پر جوش دریا نکلا اور مجھے تنکے کی طرح اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ جذبات کا ایسا طوفانی ریلا تھا کہ اس کے بہاؤ میں میرا وجود گم ہوگیا۔ سارا سفر خود فراموشی کی لہروں پر ہی طے ہوا اور جب یہ ہیجان انگیز سفر اپنے اختتام کو پہنچا تو میں نے خود کو شدید حیرانی اور شرمندگی کے ساحل پر کھڑا پایا''۔

ان کی نثر میں شعری لطف و حسن کی آمیزش ہے۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بے حد محتاط اور نازک خیال ہیں۔ گہرے غور و فکر کے بعد انہیں اس طرح برتتے ہیں کہ متبادل کی تلاش مشکل ہوتی ہے۔ انہیں منظر نگاری اور جزیات نگاری میں کمال حاصل ہے۔ الفاظ کے ذریعہ اتنی صاف اور مکمل تصویر کشی کرتے ہیں کہ مناظر کے خدوخال واضح طور پر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ افسانہ ''آنگن کی دیوار'' میں منظر نگاری کا حسین نمونہ دیکھئے۔

''کچی مٹی سے ایک مانوس لیکن پراسراری سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی جس سے ان کی مدتوں کی آشنائی تھی لیکن جس نے آج تک ان پر اپنے سارے بھید نہیں کھولے تھے۔ انہوں نے گہری سانس لے کر اس خوشبو کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اتارا۔ یہ خوشبو ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ جانے کہاں کہاں اڑا لے جاتی جہاں سے لوٹ کر کبھی وہ بالکل ہشاش بشاش ہوجاتے اور کبھی بے حد ملول اور دل گرفتہ۔ سامنے ہی آنگن کی پچھلی دیوار سے لگا امرود کا درخت خاموش، گم صم سا کھڑا تھا۔ اس کے بڑھتے سائے آنگن کے زیادہ سے زیادہ حصے کو اپنے نرم بازوؤں میں بھرنے کی کوشش کررہے تھے۔ دور آسمان پر سورج اپنی اشک آلود آنکھوں سے مڑ مڑ کر چھوٹتے جارہے مناظر کو دیکھتا ہوا وداع ہورہا تھا۔ حالانکہ اس کا پھر صبح آنے کا وعدہ تھا لیکن اس بے ثبات زندگی میں

وعدے کا کیا اعتبار؟ کیا پتہ کل وہ آ ہی نہ سکے یا جس کی خاطر آئے اسی کو گم پائے۔ یہاں حاصل ہونے والا لمحہ ہی حاصل زندگی ہے''۔

ان کے اہم اور یادگار افسانوں میں مذکورہ بالا افسانوں کے علاوہ زمین، سگ گزیدہ دھوپ سنوارے، نم زمین کو روندتے پاؤں، سعی لا حاصل اور یاد سہارے، وغیرہ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان میں زمین، ماں جیسی زمین کے نوحے، زوال آمادہ مادیت پرست سماج میں زندہ رہنے کے لیے ضمیر کا قتل، ایک پر شکوہ شہر کے کھنڈر میں تبدیل ہونے کا کرب، ماں کے سینے کو خود غرضی کے پاؤں سے روندتے بچے، جدوجہد آزادی کے سعی لا حاصل ثابت ہونے کا انکشاف اور یادوں کے سہارے زندگی کی قید میں کٹتے شب و روز، کو اتنے فن کارانہ حسن کے ساتھ افسانوی پیکر عطا کیا گیا ہے کہ قاری کا ذہن پوری طرح تسخیر ہو کر ان کے ساتھ محوِ سفر ہو جاتا ہے۔ ان کا تخیل نہ صرف جہاں کے آشنا گوشوں کو نئے سرے سے نئے انداز میں متعارف کراتا ہے بلکہ نئے گوشے بھی دریافت کرتا ہے۔ غم جاناں سے لے کر غم دوراں تک کے سفر میں جو بھی قابل دید مقامات آتے ہیں نوک قلم کے ذریعہ ان کی شبیہ ابھارتے ہوئے وہ آگے بڑھ تو جاتے ہیں لیکن حسب توقع پیچھے مڑ کر ضرور دیکھتے ہیں کہ پتھر بن جانا ہر فن کار کا مقدر ہے۔ ماضی کی بازیافت ان کا پسندیدہ موضوع ہے۔ یوں بھی انسانی زندگی کے رنج و غم، محرومی و محکومی، خود غرضی و خود پرستی اور ناانصافی و نابرابری سے بیزار ہو کر عام آدمی ہو کہ فن کار اچھے دنوں کی یادوں کا سہارا ہی تلاش کرتا ہے۔ یاد سہارے بار سر کم تو نہیں ہوتا مگر کم ہونے کا احساس ضرور ہو جاتا ہے اور یہی احساس سفر حیات کو قدرے آسان اور ساز گار بنا دیتا ہے۔ سلیم سرفراز کے افسانے موضوع و مضمون ہو کہ زبان و بیان ہر لحاظ سے ایسی کشش اور سحر آفرینی رکھتے ہیں کہ قاری ان کی مملکت میں داخل ہونے کے بعد جب تک ایک ایک منظر سے لطف و حظ کشید نہ کر لے، باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک افسانہ نگار کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ کوئی بھی قاری ان کے افسانوں کے بحرِ بے کنار میں ڈوب کر تہی دست نہیں لوٹتا۔ علم و فکر کے گوہر گراں مایہ نہ سہی لیکن جذبہ و احساس کی سیپیوں سے تو دامن بھر ہی جاتا ہے اور حیات کو بامعنی اور ثمر دار بنانے میں ان کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سلیم سرفراز اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں میں بلند قد اور بنگال کی افسانوی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں تو اس کی بڑی وجہ زمین سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ وہ زمین پر رہ کر زمین سے جڑے مسائل کو سطح زمیں سے اوپر اٹھا کر اہل زمیں سے مخاطب ہوتے ہیں کہ زمین کی بقا و سلامتی کی خاطر زمین کے قرض اور فرض کو ادا کر دیں کہ زمین فریاد کے لیے اپنے لب وا نہیں کرتی لیکن اہل دل کے واسطے اس کی غم انگیز خاموشی بھی کم متاثر کن نہیں ہوتی۔ وہ اپنے افسانوں میں کسی فکر نو یا نظریئہ کہن کی تبلیغ نہیں کرتے بس متنوع موضوعات کو اپنے شائستہ اور مہذب انداز میں حسین اور پر وقار جامئہ الفاظ میں ملبوس کر کے فصیل ادب پر سجا دیتے ہیں جہاں قارئین کی نکتہ شناس نگاہوں کے ذریعہ ان کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ باشعور اور صاحب دل قارئین کو ان کے افسانوں کے مطالعے سے مایوسی نہیں ہوتی بلکہ امید بندھتی ہے کہ ان کے آئندہ تخلیق ہونے والے افسانے اور بھی بہتر اور پر اثر ہوں گے۔

افسوس کہ افسانوں کا یہ معتبر نام ان دنوں صنف شاعری کی طرف زیادہ مائل ہے۔ ہر چند کہ افسانوں کی طرح ان کی شاعری بھی بے حد خوبصورت اور فکر انگیز ہوتی ہے لیکن ان کی شناخت بہر حال افسانوں سے قائم ہے اس لیے اگر وہ افسانہ نگاری پر بھرپور توجہ دیں تو ان کے ساتھ بنگال کے اردو ادب کے حق میں بھی بہتر ہوگا اور یقیناً ان کا شمار بنگال کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں ہوگا۔

نذیر احمد یوسفی

اردو دربار، رحمانیہ اسٹریٹ، آسنسول

☆☆☆☆☆

دھوپ سنوارے

میں مرشد آباد سے باہر جانے والی جیپ پر بیٹھ چکا تھا کہ میری نگاہ دور سے آتے ہوئے نواب اختر الدولہ پر پڑی۔ وہ قریب آئے تو میں جیپ سے اتر گیا اور کسی قدر شرمندگی سے کہا۔

''آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی''۔

''تکلیف کیسی''؟ ان کے باریش چہرے پر شفقت بھری مسکان ابھری۔ انہوں نے اپنے ہاتھ میں موجود چھوٹا سا پلاسٹک کا ڈبہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اسے رکھ لو بیٹے! اس میں دوران سفر کھانے کی کچھ چیزیں ہیں۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے تیار کی ہے''۔

ان کے لہجے میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ مجھے انکار کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ میں نے ڈبہ لیتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا تو وہ قدرے آبدیدہ ہو گئے۔ میں ان کے لاج میں دو روز قیام پذیر رہا تھا اور شہر کی سیاحت کے بعد واپس جا رہا تھا۔ اس مختصر سے عرصۂ قیام میں ہی ان سے خاصی قربت پیدا ہو گئی تھی۔

پرسوں میں اسی طرح ایک جیپ میں سوار ہو کر مرشد آباد کی حدود میں داخل ہوا تھا۔ سہہ پہر ہونے والی تھی، ماہ اپریل کے آخری ایام تھے۔ فضا میں امس بھری گرمی کی تمازت تھی۔ جیپ کے سفر میں ہوا کے مسلسل گرم جھونکوں سے گرچہ چہرہ تپنے لگا تھا لیکن گھٹن کا احساس نہیں تھا، لیکن جیپ سے اترتے ہی گرمی کے ساتھ گھٹن بھی محسوس ہونے لگی تھی اور جسم پسینے سے بھیگنے لگا تھا مجھے فوری طور پر نہانے کی خواہش ہو رہی تھی تا کہ سفر کی تکان اور گرمی کے اثرات سے نجات حاصل ہو سکے۔ میں نے جیپ کے ڈرائیور سے قیام کے لئے کسی مناسب جگہ کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے سراج الدولہ لاج کا پتہ بتا دیا جو قریب ہی واقع تھا۔ میں اپنا سفری بیگ لئے ہوئے لاج کے دروازے پر پہنچا تو ایک باریش اور باوقار معمر شخص نے میرا استقبال کیا۔ انہوں نے رسمی خانہ پری

کے بعد ایک کمرے میں میرے قیام کا بندوبست کردیا۔ میرے استفسار پر انہوں نے مجھے باتھ روم تک پہنچادیا جو کمرے کے باہر ہال کے ایک کنارے موجود تھا۔ میں اچھی طرح نہا کر کر اپنے کمرے میں آیا اور لباس تبدیل کر کے واپس ہال میں آ گیا۔ وہاں کچھ میز کرسیاں بچھی تھیں۔ میں نے ایک کرسی سنبھالی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہی معمر شخص چائے لے کر حاضر ہوئے تو مجھے کچھ تعجب ہوا۔ مجھے انہیں لاج کا ملازم سمجھنے میں کچھ تامل ہو رہا تھا۔ لیکن پھر وہ اس طرح کی خدمات کیوں انجام دے رہے تھے؟ انہوں نے چائے کا کپ میز پر رکھا تو میں نے استفہامیہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ وہ سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''میں اس لاج کا مالک ہوں۔ اختر الدولہ...... قدرے توقف کے بعد انہوں نے دریافت کیا۔ ''رات کو کیا کھاؤ گے؟ جو تم پسند کرو وہی بنادیں گے''۔

''بنادیں گے''؟ میں نے حیرت سے ان کی بات دہرائی تو انہوں نے وضاحت کی۔

''اس موسم میں یہاں شاذونادر ہی لوگ آتے ہیں۔ اس لیے خانساماں کو رخصت کردیا ہے۔ ہم اپنا کھانا خود بناتے ہیں۔ اگر تمہاری طرح کوئی مسافر آجائے تو کھانا ساتھ ہی بن جاتا ہے۔ کوئی پریشانی نہیں ہوتی''۔

''آپ جو پسند کریں، بنادیں''۔ میں نے بے توجہی ظاہر کی۔ ''دراصل مجھے یہاں کے قابل دید تاریخی مقامات دیکھنے ہیں''۔

قابل دید نہیں ...... قابل عبرت کہو......'' یکا یک ان کے لہجے میں گہری افسردگی جھلک اٹھی۔ ''وقت کے گھوڑوں کی بے رحم ٹاپوں نے سب کچھ پامال کرڈالا۔ فقط کھنڈرات باقی ہیں''۔

میں نے ان کے درد کو اچھی طرح محسوس کیا۔ اپنی نگاہوں کے سامنے اپنے آباواجداد کے شہر کو بتدریج اجڑتے ہوئے دیکھنا آسان نہیں ہوتا۔

''میں راجدھانی دہلی سے آیا ہوں۔ وہیں کے جامعہ ملیہ یونیورسٹی کے تحت ملک کے تاریخی مقامات پر ریسرچ کررہا ہوں۔ اسی کی تکمیل کی خاطر مختلف شہروں سے ہوتا ہوا یہاں پہنچا ہوں''۔

میں نے مرشد آباد میں اپنی آمد کی غرض وغایت بتائی۔ انہوں نے کچھ لمحہ سوچا اور پھر گویا ہوئے۔

''اگر تم چاہو تو کل صبح ایک تجربہ کار گائیڈ کا انتظام کر دیتے ہیں۔ وہ تمام مقامات دکھادے گا اوران سے متعلق ضروری معلومات بھی فراہم کر دے گا''۔

میں نے ان کی تجویز سے اتفاق کیا ارپھر دوسرے موضوعات پر گفتگو ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے لہجے میں شائستگی اور نرمی کے ساتھ ایک عجیب سے وقار کا عنصر بھی موجود ہے۔ میرے استفسار پر یہ عقدہ کھلا کہ ان کا سلسلۂ نسب براہ راست نواب سراج الدولہ سے جا ملتا ہے۔ مجھے کچھ زیادہ استعجاب نہیں ہوا۔ اپنے سفر کے دوران میری ملاقات ایسے کئی لوگوں سے ہوئی تھی جن کے اباواجداد تو حکمرانِ وقت تھے لیکن وہ خود بے حد کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ وقت کسی کا محکوم نہیں ہوتا، وہ تو خود حکم صادر کرتا ہے اور چشم زدن میں تخت، تختہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ان جیسے لوگوں کی ذہنی کیفیت کو محسوس کر کے خاصا رنج ہوتا ہے۔ یہ دوہری اذیت میں مبتلا افراد ہیں۔ بختی حالات سے نبرد آزما حیات گراں مایہ اثاثۂ ماضی کے لٹ جانے کے عذاب سے کبھی مفر نہیں پاتی۔

صبح سویرے میں تیار ہو کر کمرے سے باہر آیا تو انہوں نے اطلاع دی کہ تھوڑی ہی دیر میں گائیڈ حاضر ہو جائے گا۔ میں نے ہلکا سا ناشتہ لیا اور پھر چائے پی رہا تھا کہ ہال میں ایک سانولے رنگ کا دبلا سا نوجوان داخل ہوا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور مودبانہ انداز میں میرے قریب کھڑا ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ وہی فخرو گائیڈ ہے جسے نواب صاحب نے میری رہ نمائی کے لیے منتخب کیا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ وہ میری زبان سے بھی واقف تھا۔ میں فخرو کے ساتھ روانہ ہوا تو دھوپ نوزائیدہ اور نرم تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ لمحاتی نرمی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی تپش میں اضافہ ہوتا جائے گا اور راستہ چلنا دشوار ہو جائے گا۔

چار قدم کا فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ بہت سارے برہنہ جسم مفلوک الحال بچوں نے ہمیں گھیر لیا۔ سبھی کے ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور بنگلہ زبان سے نابلد ہونے کے باوجود ان کی لجاحت آمیز آوازوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سب مجھ سے پیسوں کے طلب گار تھے۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا ہی تھا کہ فخرو نے مجھے روک دیا۔

''رہنے دیں صاحب۔ آپ نے انہیں کچھ دے دیا تو اتنے افراد جمع ہو جائیں گے کہ آگے بڑھنا مشکل ہو جائے گا''۔

اس نے ڈانٹ کر بچوں کو دور بھگایا اور مجھے ان کے حصار سے نکال کر آگے بڑھا۔ میں نے بچوں پر نگاہ ڈالی۔ سب بڑی حسرت اور نا امیدی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ یک لخت مجھے کسی مضمون میں مذکور اس خط کی یاد آئی جسے عہد سراج الدولہ میں بنگال کے گورنر لارڈ کلائیو نے ملکہ برطانیہ کو تحریر کیا تھا۔ اس خط میں اس نے مرشد آباد کی شان و شوکت اور عظمت و امارت کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں درج کیا تھا۔

''بس یوں سمجھئے یور ہائی نیس۔ مرشد آباد اپنے لندن کی طرح ہی عظیم اور خوبصورت شہر ہے لیکن لندن اتنا دولت مند نہیں جتنا مرشد آباد ہے''۔

وہ خط تو آج بھی برٹش میوزیم میں محفوظ تھا لیکن وقت کے بگولوں میں مرشد آباد کی امارت بالکل منتشر ہو چکی تھی۔ شہر کے تمام خوبصورت اور عالیشان محلات کھنڈر میں تبدیل ہو چکے تھے اور پورے ماحول پر عسرت اور نحوست کی دبیز چادر تن گئی تھی۔

فخرو راستے میں پڑنے والے اہم مقامات کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالتا جا رہا تھا لیکن میں بالکل خالی الذہن سا اس کے قدم سے قدم ملاتا ہوا چل رہا تھا۔ ایک جگہ مجھے کسی مسجد کے مبہم سے آثار نظر آئے لیکن اس کے احاطے میں گائیں بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے فخرو کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تو اس نے لاپرواہی سے کہا۔

''کہا جاتا ہے کہ پورے شہر میں سات سو مسجدیں تھیں لیکن اب صرف سات مسجدیں ایسی بچی ہیں جن میں باجماعت نماز ادا ہوتی ہے''۔

مجھے یہ سوچ کر گہرا رنج ہوا کہ زمانے کے نشیب و فراز نے خدا کے گھر بھی تہہ و بالا کر دیئے۔

فخرو مجھے ایک عالیشان اور قدرے بہتر حالت میں موجود اس عمارت کے قریب لے آیا جو ہزار دواری کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ میں فن تعمیر کے اس دلچسپ اور عجیب نمونے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس عمارت میں دروازے ہی دروازے نظر آ رہے تھے۔ ایک ہی طرح کے نقش و

نگاروالے دروازے۔ فخرو کے اس انکشاف پر میں حیرت زدہ رہ گیا کہ سارے دروازے اصلی نہیں ہیں۔ بیشتر دروازے مصنوعی ہیں جو اصلی دروازوں کے مشابہ ہیں۔ سچ مچ کاریگری کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ اگر کوئی نہ بتائے تو اصلی نقلی کی شناخت تقریباً ناممکن تھی۔ شاید اس کی تعمیر بھی حفاظتی نقطۂ نگاہ سے کی گئی تھی تاکہ کوئی بیرونی دشمن کسی طرح کا نقصان پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن درونِ خانہ سے ہی رہنمائی اور حمایت حاصل ہو جائے تو......

شہر کے کھنڈرات گواہ ہیں کہ تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود انگریزی سپاہ بآسانی شہر میں داخل ہوئی تھی اور سرسبز زمین سرخ کرتی ہوئی تمام اثاثے لوٹ لے گئی تھی۔ وقت نے عبرت انگیز کروٹ لی تھی۔ لکھنؤ کی مشہور طوائف منی بیگم میر جعفر کی ملکہ بن کر مرشد آباد پر در پردہ حکمرانی کرنے لگی تھی ۔ معتبر حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس وقت دنیا کی دوسری امیر ترین عورت تھی۔ انگریزی تسلط کے بعد اس کی تمام دولت کس دروازے سے برطانیہ پہنچ گئی، کوئی نہیں جانتا۔ کاروبار حسن کے ذریعہ پس انداز کی ہوئی دولت آخر دلالوں کے ہی ہاتھ لگی تھی۔

میں فخرو کے ساتھ ہزاردواری کی عمارت میں داخل ہوا۔ اسے میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور وہاں نوابی عہد کی یادگاریں رکھی ہوئی تھیں۔ پلاسی کی جنگ میں استعمال ہونے والے اسلحوں کے علاوہ ابوالفضل کے آئینِ اکبری، کا اصلی نسخہ بھی موجود تھا۔ ایک کمرے میں چند ظروف سجے ہوئے تھے جن کے متعلق فخرو نے بتایا کہ انہیں ایسی دھاتوں کی آمیزش سے بنایا گیا تھا کہ یہ زہر آلود کھانے کی پہچان بتا دیتے تھے۔ یہ ظروف نواب سراج الدولہ کے زیر استعمال تھے۔ اسی طرح کی دیگر احتیاطی تدابیر تقریباً تمام نوابوں اور بادشاہوں کے یہاں اپنائی جاتی تھیں۔ انہیں محلاتی سازش اور غداری کا ایسا خدشہ لگا رہتا تھا کہ ان کے لیے اپنے محل میں بھی پرسکون اور بے خوف زندگی گزارنا محال تھا۔ لیکن تمام احتیاط کے باوجود ان میں سے اکثر اپنوں کی ہی سازش اور غداری کے شکار ہوئے تھے۔ نواب سراج الدولہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ فخرو کے بیان کے مطابق انگریزوں کی مہربانی سے سراج الدولہ کو بے دخل کر کے میر جعفر مرشد آباد کا نواب بنا تو پورا شہر مقتل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ میر جعفر نے سراج الدولہ کے تمام رشتہ داروں اور وفاداروں کو اپنے لیے خطرہ محسوس کیا اور

انہیں چن چن کر قتل کروا دیا گیا۔ مرشد آباد کی سرزمین ان بے گناہوں کے خون سے تر ہوگئی تھی۔ کتنے ہی دنوں تک یہ خوں چکاں سلسلہ چلتا رہا تھا۔ آخرش مرشد آباد میں سراج الدولہ کا نام لینے والا ایک فرد بھی زندہ نہیں رہ سکا تھا۔ سب کے سب قریب ہی کے خوش باغ قبرستان میں دفن کر دیئے گئے تھے۔

انسانوں کے ظلم و بربریت کے بارے میں سوچتا ہوا میں بے حد رنجیدہ طبیعت سے باہر آ گیا۔ بغل میں ہی بڑا امام باڑہ تھا جس کے گنبد پر سیاہ علم لہرا رہا تھا۔ گرم دوپہر کا سناٹا چہار سو طاری تھا لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ماتم کی اجتماعی مجلس بجی ہے اور ہر بشر انفرادی طور پر اپنے ہی کسی عزیز کی میت پر نوحہ کناں ہے۔ گریہ وزاری کا ایسا شور بپا تھا کہ کچھ اور سننے سے میری سماعت معذور تھی۔ زمین کا کون سا ایسا خطہ تھا جہاں تبدیلیِ کردار کے ساتھ کربلا کا سانحہ رونما نہیں ہوا تھا۔ اسی شہر کی اسی بڑی سڑک پر نواب سراج الدولہ کو ہاتھی کے پیروں سے باندھ کر اس وقت تک گھسیٹا گیا تھا جب تک اس کی موت واقع نہ ہوگئی۔ اس کے زخمی جسم کا قطرہ قطرہ لہو اسی سڑک میں جذب ہوتا گیا تھا۔ آج بھی ہر خطۂ زمیں انسانوں کے خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ صدیوں سے یہ سلسلہ جاری تھا اور شاید صدیوں تک جاری رہنے والا تھا۔ یہ زمین نہ جانے کس جنم کی تشنہ ہے کہ سیراب ہوتی ہی نہیں۔

تمام قابل ذکر مقامات دیکھ کر ہم لوٹنے لگے تو سہ پہر ہونے والی تھی۔ ہر عروج کی طرح دھوپ بھی روبہ زوال تھی۔ میں کھنڈر بن گئی عمارتوں پر افسردہ نگاہیں ڈالتا ہوا چل رہا تھا۔ یک لخت ایک منظر نے میرے قدم روک لیے۔ ایک کھنڈر کے دروازے پر بیٹھا ہوا ایک نحیف و ناتواں بوڑھا اپنی لاٹھی اٹھائے چیختا ہوا عمارت کے پیچھے کی جانب لپکا تھا میں نے دیکھا کہ وہاں کچھ لڑکے ڈھتی ہوئی دیوار پر زور آزمائی کر رہے تھے۔ میں کسی قدر استعجاب سے لنگی بنیان میں ملبوس بوڑھے کو تکتے ہوئے فخرو سے مخاطب ہوا۔

''تعجب ہے کہ ان کھنڈروں کے لیے بھی دربان مقرر ہیں۔ میں نے اکثر عمارتوں کے دروازوں پر انہیں تعینات دیکھا ہے''۔

فخرو کے سانولے چہرے پر سیاہی کا رنگ چڑھ گیا اور اس کی آنکھوں میں حزن و یاس کے

گہرے سائے لہرائے۔ اس نے قدرے توقف کے بعد مضمحل لہجے میں کہا۔

''یہ دربان نہیں ہیں جناب۔ یہ لوگ ان کھنڈر نما حویلیوں کے مالک ہیں''۔

''کیا''؟ میں چونکا۔''یہ مفلوک الحال بوڑھے ان کے مالک ہیں''؟

''ہاں جناب: یہاں بیشتر عمارتوں کو محکمۂ آثار قدیمہ کے توسط سے سرکار نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ ان کے مالکان انہیں فروخت کر سکتے ہیں اور نہ کسی اور مصرف میں لا سکتے ہیں۔ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ وقت کے ساتھ نہ ان کے وظیفے میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا اور نہ ہی ان کی باز آبادکاری کی کوئی کوشش کی گئی۔ کسی بھی سرکار نے ان ضبط شدہ جائداد کی حفاظت میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی اور نہ ہی یہاں ذرائع آمدنی پیدا کرنے کے جامع منصوبے بنائے گئے۔ اس مجرمانہ چشم پوشی اور بے توجہی کے باعث پورا شہر کھنڈر بن گیا۔ زیادہ تر افراد شہر سے نکل گئے اور وقت کے اژدہام میں اپنے حصے کا رزق تلاش کرتے ہوئے جانے کہاں گم ہو گئے۔ لیکن یہ بوڑھے اپنی وراثت پر پہریدار بنے بیٹھے ہیں''۔

میں نے اس بوڑھے کو دیکھا جو شرارتی لڑکوں کو بھگا کر ایک بار پھر محراب نما شکستہ دروازے پر بیٹھ گیا تھا اور ملگجی نگاہوں سے ہماری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ جانے کیوں مجھے وہ بوڑھا ایک پوری قوم کا نمائندہ محسوس ہوا جو نحیف و ناتواں ہونے کے باوجود اپنے آباواجداد کی وراثت کے تحفظ میں ہر بادِ مخالف سے اپنی سکت بھر نبرد آزما تھا۔

میں بوجھل اور تھکے قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ تمام شہر کے مشاہدے کے بعد مجھ پر گہرا اضمحلال اور ملال طاری ہو چکا تھا۔ میں نے بہت سارے تاریخی شہر دیکھے تھے اور میں نے واضح طور پر محسوس کیا تھا کہ مسلم آثار والے مقامات کی توسیع و ترقی میں دانستاً غفلت برتی جاتی ہے لیکن مرشد آباد کا حال تو سب سے ناگفتہ بہ تھا۔ برسراقتدار حکمرانوں کا شدید تعصب ہی تھا کہ ایک عظیم الشان اور بارونق شہر زوال کے گہرے اندھیرے میں ڈوب چکا تھا۔ کسی نے کولکاتہ کو مرتا ہوا شہر قرار دیا تھا۔ اگر وہ مرشد آباد کا مشاہدہ اور مطالعہ کرتا تو اس پر آشکار ہوتا کہ کسی جیتے جاگتے، زندگی سے بھرپور شہر کو بتدریج کتنی سفاکی اور عیاری سے قتل کیا جاتا ہے اور اس قتل عمد پر باشندگان شہر پر کیسی قیامت گزرتی ہے۔

میں سراج الدولہ لاج میں داخل ہوا تو شام کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے لیکن فضا میں ایسا حبس تھا کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ میں نے فخرو کو طے شدہ رقم دے کر رخصت کیا اور غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ تر و تازہ ہو کر ہال میں بیٹھا ہی تھا کہ اختر الدولہ صاحب چائے کے ساتھ تشریف لے آئے۔ چائے نوشی کے دوران وہ میرے دیکھے گئے مقامات کی تفصیل سنتے رہے اور ان کے کچھ نئے گوشے اجاگر کر کے میرے معلومات میں اضافہ کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے عیاں تھا کہ وہ غیروں کے ظلم و ستم سے زیادہ اپنوں کی سازش اور غداری سے کبیدہ خاطر اور شکستہ دل تھے۔ میں ان سازشوں اور غداریوں سے بخوبی واقف تھا کہ میرا تو تعلق ہی اس سرزمین دہلی سے رہا تھا جو ان فصلوں کی آبیاری کے لیے صدیوں سے بے حد زرخیز رہی تھی۔ مرشد آباد تو غداری کے صرف ایک ہی منظر کا گواہ تھا۔ شہر دہلی نے تو اتنے مناظر دیکھے ہیں کہ اس کی آنکھیں ہی پتھرا گئی ہیں۔

جیپ میں سواریاں مکمل ہو گئیں تو ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ڈرائیور کے پاس والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے نواب اختر الدولہ کو الوداعی سلام کیا۔ انہوں نے بے حد خلوص و محبت سے مجھے دعائیں دیں۔ جیپ مرشد آباد سے باہر نکلنے کے لیے چل پڑی۔ جیپ معتدل رفتار سے چل رہی تھی کہ اچانک اس کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ مجھے یاد آیا کہ شہر میں آتے وقت بھی ٹھیک اسی مقام پر جیپ کی رفتار بے حد بڑھ گئی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے اپنے تجسس کا اظہار کیا تو وہ گہری بے زاری اور نفرت سے بولا۔

''اس جگہ ہر ڈرائیور اپنی گاڑی کی رفتار بڑھا دیتا ہے کیونکہ یہیں پر غدار میر جعفر کی قبر ہے''۔

اور تب مجھ پر منکشف ہوا کہ راجدھانی دہلی کی ہر شاہراہ پر گاڑیاں اتنی تیز کیوں چلتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

اپنی زمین، اپنی ماں

''آمی کینو جابو؟ آمرا نجے گرام چھیڑے انو جائیگہ کینو جابو''؟

(میں کیوں جاؤں؟ ہم لوگ اپنا گاؤں چھوڑ کے دوسری جگہ کیوں جائیں گے؟) نجم النسا گھر کے وسیع کچے آنگن کو جھاڑو سے صاف کرتے ہوئے ایک بار پھر بڑبڑائی۔ اس کے لہجے میں شدید غصے کی تپش تھی۔ شمس الدین شیخ نے خالی ویران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ گزشتہ چند دنوں سے وہ جوالامکھی بنی ہوئی تھی۔ موسم خزاں کسی ناپسندیدہ مہمان کی طرح وارد ہو چکا تھا۔ آتے ہی اس نے اپنے بال و پر پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔ گاؤں کی نرم زرخیز زمین پر، تناور درختوں کی شاخوں پر، ننھے ننھے پودوں پر، ہر شئے پر اس نے اپنا مخصوص زرد رنگ چڑھا دیا تھا۔ فنا کے نادیدہ بے رحم ہاتھ شاخوں سے جڑے رہنے کی شدید خواہش کے باوجود زرد پڑ گئے پتوں کو ہوا میں بکھیر رہے تھے۔ آنگن میں بہت سے پیڑ کھڑے تھے۔ آم، امرود، جامن کے نیم کا بھی تھا اور ایک درخت ناریل کا تھا۔ باہری دروازے کے بالکل پاس، سب کے سب بے لباس اور اداس، آنگن خشک پتوں سے اٹا پڑا تھا۔ نجم النسا انہیں ایک کنارے لگا رہی تھی۔ باہر پوری زمین ننگی پڑی تھی اور فضا میں ایک عجیب سے نحوست پھیلی ہوئی تھی۔ ویسے یہ نحوست تو گاؤں میں بہت پہلے ہی داخل ہو چکی تھی۔ خزاں کی آمد سے بھی پہلے، جب بہت سارے سرکاری کارندوں کی گاؤں میں آمد ہوئی تھی۔ انہوں نے گھروں کا سروے کیا تھا۔ اپنے ساتھ لائے ہوئے فارم میں نام اور ولدیت کے ساتھ دوسری تفصیلات درج کی تھیں۔ لوگوں میں ان سے متعلق خاصا تجسس تھا۔ لیکن پردھان کی ہدایت تھی کہ ان لوگوں سے مکمل تعاون کیا جائے۔ پھر بھی سرکاری عملے پر کون اعتماد کرتا؟ بیشتر افراد نے کچھ نہ کچھ جانکاری چھپالی تھی۔ پھر انہوں نے زمینوں کی پیمائش کی تھی۔ کاغذوں میں جانے کیا کیا درج کیا تھا۔ وہ اپنا کام مکمل کر کے چلے گئے تھے۔ ان کی نقل و حرکت سے لوگوں کے ذہن میں

بہت سارے خدشوں نے جنم لیا تھا۔ کچھ دنوں بعد گاؤں کے پردھان نے عوامی اجلاس طلب کیا تو یہ خدشات کچھ اور بڑھ گئے۔

اجلاس میں پردھان کے علاوہ کچھ اجنبی چہرے بھی موجود تھے جن کی رعونت اور تمکنت سے آشکار ہوتا تھا کہ وہ سرکاری محکمے کے لوگ ہیں۔ پردھان نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے تمہید باندھی اور اجنبی چہروں نے تفصیل سے مضمون بیان کیا۔ انہوں نے ریاست کی ترقی اور خوشحالی کی بات کی، صنعتی انقلاب کا تذکرہ کیا۔ خصوصی اقتصادی خطے کا خاکہ پیش کیا اور بے شمار روزگار فراہم ہونے کی خوش آئند اطلاع بھی دی لیکن گاؤں کے باشندوں کو صرف اتنا سمجھ میں آیا کہ سرکاران کے گاؤں کی ساری زمینیں اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کر چکی ہے جن کے عوض سرکاری نرخ کے مطابق زمین مالکوں کو رقم ادا کر دی جائیگی۔

اجلاس سے واپسی کے وقت تمام لوگ اس طرح پژمردہ اور مضمحل تھے جیسے کسی قریبی عزیز کو قبرستان میں دفنا کر آرہے ہوں۔ شمس الدین شیخ اپنے گھر میں داخل ہوا تو نجم انسا ناریل کی جڑوں میں پانی دے رہی تھی۔ اس نے حسرت سے یاد کیا کہ ناریل کا یہ درخت اس کے باپ نے اس کی شادی کے وقت لگایا تھا۔ کسی نے فقرہ بھی کسا تھا۔ ''ناریل کا پیڑ بو رہے ہو۔ پھل کھاؤ گے''؟

اور اس نے کتنے پر یقین آواز میں جواب دیا تھا۔ ''میرے پوتے، پڑپوتے تو کھائیں گے''۔

نجم النساء نے سرسری انداز میں اجلاس کے بارے میں دریافت کیا تو اس کے حلق میں گولا سا پھنسا۔ وہ بدقت تمام اتنا ہی کہہ پایا کہ سرکار نے ان لوگوں کو گاؤں چھوڑنے کا حکم جاری کیا ہے۔ نجم النساء وحشت زدہ ہرنی کی طرح بھڑکی۔ اس نے گہری بے یقینی سے شمس الدین کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر گہرے حزن و یاس کا پرتو دیکھ کر حواس باختہ ہوگئی۔ وہ ناریل کے چکنے تنے میں اپنے بازو حمائل کرتی ہوئی ہیجانی کیفیت میں چیخی۔

''آمرا کینو چھاڑ بو؟ ایٹا آمادیر گرام آچھے۔ کے چھاڑیئے دیبے؟ (ہم کیوں چھوڑیں گے؟ یہ ہمارا گاؤں ہے۔ کون چھڑائے گا؟)

شمس الدین نے اسے راجا اور پرجا کے درمیان واقع صدیوں پرانے فرق کو سمجھانا چاہا۔
اسے بتانا چاہا کہ زمین سے جڑے مسائل بھی خلا میں معلق ائر کنڈیشنڈ دفتروں میں ہی حل کیے جاتے ہیں۔ ان کے ایک ہوائی فیصلے سے ہزاروں افراد اپنی جڑ سے اکھڑ جاتے ہیں اور انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کاغذ پر پنسل سے لکیریں کھینچتے رہنے والوں کیلئے انسانی وجود بھی انہیں لکیروں کی طرح ہے، جسے جب چاہیں، ایریزر سے مٹا ڈالیں۔ ان کے یخ بستہ پتھریلے کمروں میں زمین کی نرمی اور انسانی جذبات کی گرمی کہاں؟ ان کمروں میں رہائش پذیر لوگ بھی شاید سرد پتھر میں ہی تبدیل ہو جاتے ہیں لیکن شمس الدین کچھ نہ کہہ پایا اور نجم انسا کو یوں ہی پھڑ کتا ہوا چھوڑ کر اندر کمرے میں بچھی ہوئی کھاٹ پر ڈھ گیا۔ نجم النساء گہرے اضطراب اور سراسیمگی کے عالم میں سارے آنگن میں بوکھلائی ہوئی پھرتی رہی۔

نجم النساء اس کی بیوی بننے سے قبل بھی اسی گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کی پیدائش ہی یہیں کی مٹی میں ہوئی تھی۔ سسرال سے دو فرلانگ کی دوری پر ہی اس کا مائیکہ تھا۔ وہ گھر جہاں اس نے کتنے ہی معصوم اور یادگار لمحات گزارے تھے۔ بیشتر لوگوں کی طرح اس کے بابا بھی کسان تھے۔ تھوڑی سی زمین تھی۔ لیکن یہاں کی مٹی ایسی زرخیز تھی کہ خاصی پیداوار ہو جاتی تھی۔ کنبہ بھی کون سا بڑا تھا۔ ماں کے علاوہ بس ایک بڑا بھائی تھا۔ وہ بابا کی لاڈلی گڑیا تھی۔ وہ شام کو کھیت میں کام کر کے لوٹتے تو تکان سے چور ہوتے۔ لیکن اس کا لمس پاتے ہی جیسے ساری تھکن اتر جاتی اور وہ از سر نو تر و تازہ ہو جاتے۔

وہ اکثر کہتے کہ ان کی بیٹی کے لمس میں وہ جادو ہے کہ سوکھے پیڑ کو بھی چھو لے تو سرسبز ہو جائے۔ ان کی بات سن کر وہ تھوڑی حیران ہوتی اور بہت زیادہ خوش۔ پیڑوں کی شاخوں پر جھولا جھولتے اور گاؤں کی پگڈنڈیوں پر دوڑتے بھاگتے کب وہ جواں سال سپنوں کی سنہری وادی میں پہنچ گئی، اسے پتہ بھی نہیں چلا۔ ایک روز حسب معمول گاؤں کے تالاب سے نہا کر لوٹ رہی تھی کہ سامنے سے ایک سائیکل سوار آتا دکھائی دیا۔ قریب آنے پر اس نے شناخت کیا کہ وہ شمس الدین تھا۔ اسے بچانے کیلئے اس نے اپنی سائیکل پگڈنڈی سے اتار دی۔ لیکن شاید اسے دھیان نہیں رہا تھا

کہ تالاب کنارے کی وہ زمین دلدلی تھی جس پر گھاس جمی تھی۔ وہ خود کو سنبھال نہیں پایا اور سائیکل سمیت کیچڑ میں گر پڑا۔ جلد ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور پگڈنڈی پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو گئے تھے اور چہرے پر بھی کیچڑ کے عجیب سے نقش ونگار بن گئے تھے۔ اس مضحکہ خیز حلئے کو دیکھ کر وہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی، ہنستی ہی رہی تھی۔ شمس الدین آواک ہو کر اس ہنستی ہوئی الھڑ لڑکی کو دیکھتا رہا تھا۔ اس کا دھلا دھلا سا چہرہ قریب ہی تالاب میں تیرتے ہوئے کنول کی طرح کھلا پڑ رہا تھا۔ اس کے سیاہ گھنے بال کھلے تھے جس سے پانی کی شفاف بوندیں ٹپک کر چہرے سے پھسلتی ہوئی اس کے بھیگے بدن میں مدغم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے جسم پر بھیگی ساری لپٹی ہوئی تھی جسے اچھی طرح کسنا اسے کبھی نہ آیا۔ ہنسنے سے ساری کے بند ڈھیلے پڑ گئے تھے اور گردن کے نشیب میں واقع نرم گداز گولائیوں پر اس کا ٹکے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ قدرے نیچے کی طرف کھسک آئی تھی۔ یکا یک اسے اپنے نیم عریاں بدن کے نمایاں خطوط پر پھسلتی ہوئی شمش الدین کی نگاہوں کا احساس ہوا اور اس کی ہنسی رک گئی۔ اس نے خود پر نگاہ ڈالی اور پہلی بار اس کے بدن میں ایک نامعلوم لیکن کیف آگیں سہرن سی بھر گئی۔ اس نے اپنی ساری سنبھالی۔ پھر خود کو سنبھالا اور پھر لرزتے قدموں سے شمش الدین پر دزدیدہ نگاہ ڈالتی ہوئی اس کے پاس سے نکل گئی۔

اس ملاقات کے بعد وہ اکثر ملنے لگے اور اس سے پہلے کہ ان کی محبت کسی پر آشکار ہو، اس نے اپنے بابا سے دل کی بات کہہ دی۔ بابا تو اس کی خوشی کیلئے کسی بھی حد تک جا سکتے تھے، یہ تو محض دو فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ شادی میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں ہوئی تھی۔ اور وہ دلہن بن کر شمس الدین شیخ کے گھر آگئی تھی۔ وہ خوش تھی، بے حد خوش، اسے سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ اپنے گاؤں میں ہی رہ گئی۔ اس گاؤں میں جس کے چپے چپے سے اس کی آشنائی تھی۔ ایسی آشنائی کہ وہ آنکھیں بند کر کے اس کی ہر پگڈنڈی کو عبور کر سکتی تھی۔ اس کے ہر منظر کو واضح طور پر محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی کتنی ہی سہیلیاں بیاہ کر گاؤں سے دور چلی گئی تھیں۔ کبھی وہ آتیں تو کتنی حسرت سے پرانی خوشگوار یادوں کی چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں چنتیں۔

''ارے یہ تو وہی پیڑ ہے جس پر جھولے پڑتے تھے۔ اور یہ...... یہ وہی تالاب ہے جس

میں ہم ایک دوسرے پر ٹھنڈے پانی کی چھینٹیں اڑاتی تھیں۔ اور یہ...... یہ تو مسجد کی وہی سیڑھیاں ہیں نا جن پر ہم بچیاں مغرب کی نماز کے وقت اس انتظار میں کھڑی رہتی تھیں کہ نمازی باہر نکلیں اور ہم پر دم کر دیں تا کہ ہم بلاؤں سے محفوظ رہیں۔ کبھی کسی پیڑ کو اپنی جگہ موجود نہ پاتیں تو گھنٹوں اداس اور دل گرفتہ رہتیں جیسے ان کا کوئی عزیز بچھڑ گیا ہو۔

برسوں گزر گئے۔ وہ دو بچوں کی ماں بنی اور پھر ساس بھی۔ اب وہ چالیس بیالیس سال کی پختہ عمر عورت تھی۔ وقت کی اس بہتی دھارا میں اس کا سب سے مضبوط اور مشفق کنارہ بھی ڈوب گیا۔ اس کے بابا گزر گئے۔ انہیں گاؤں کے واحد قبرستان میں ہی دفن کیا گیا تھا۔ ان کی غیر موجودگی کے باوجود نجم النسا نے انہیں کبھی خود سے بہت دور محسوس نہیں کیا۔ کبھی وہ کسی سبب بے حد اداس ہو جاتی یا زندگی کی کسی تیز آنچ سے مرجھانے لگتی تو وہ چپکے سے قبرستان کی طرف نکل جاتی۔ قبرستان کے قریب پہنچتے ہی اسے لگتا کہ بابا وہاں اسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ دوڑ کر ان کی بانہوں میں بچوں کی طرح سمٹ جاتی۔ بابا شفقت بھرے ہاتھ سے اس کا سر سہلاتے اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پشت تھپکتے جاتے۔ اور وہ از سر نو بالکل تر و تازہ ہو جاتی۔ ہلکی پھلکی...... زندگی سے بھرپور۔

حکومت نے اپنے فیصلے پر عمل درآمد کیلئے رسمی کارروائی تیز کر دی تھی اور لوگ بری طرح متوحش ہوتے گئے تھے۔ کوئی بھی گاؤں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی بھی قیمت پر۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ان پر ایسا عذاب بھی نازل ہوگا۔ اور وہ بھی ان کی طرف سے جنہیں انہوں نے اپنا نجات دہندہ تصور کیا تھا۔ لیکن راج نیتی کے الگ ہی تقاضے ہوتے ہیں جن کے تحت اپنے بھی بیگانے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر یہاں تو شرق و غرب کا بُعد تھا۔ راج نیتی کی بساط پر وہ تو فقط پیادے تھے جنہیں راجا کے تحفظ اور مفاد کیلئے بلا توقف کسی بھی وقت پٹوایا جا سکتا تھا۔

''نہیں...... اسے پیادہ بننا منظور نہیں''۔ نجم النسا نے اپنی اس بے وقعت حیثیت سے انکار کیا اور احتجاجاً اس بساط سے باہر نکل آئی۔ اور پھر انکار کا یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ شمس الدین شیخ نے تعجب سے دیکھا کہ ہر گھر میں نجم انسائیں موجود ہیں جن کے جسم کا زیریں حصہ زمین میں پیوست ہے اور ان کی جڑیں اندر ہی اندر جانے کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔

تمام سابقہ حکومتوں کی روایت کی پاسدار موجودہ حکومت اس انکار سے بری طرح برا فروختہ ہوئی۔ یہ تو اس کے وجود سے انکار تھا۔ اس کی قوت، اس کے غرور سے انکار تھا۔ صدیوں سے کچلی اور روندی جانے والی زمین کسی ناقابل برداشت کرب سے کسمساتی ہے تو اس پر تنتے ہوئے پر فخر اور پتھریلے وجود اپنی بقا کی جدوجہد میں کوئی بھی حربہ استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے۔ حکومت کے مسلح دستے گاؤں کی سرحد کی طرف کوچ کر گئے۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ گاؤں میں داخل ہو کر تمام زمینوں کو اپنے قبضے میں لے لیں۔

مسلح دستے کی آمد کی خبر سن کر سب سے پہلے نجم النسا دوڑی۔ پھر اس کے پیچھے تمام گھروں سے نجم النسائیں نکلیں اور پھر ان کے تعاقب میں سارے مرد نکل پڑے۔ مسلح دستے ایسے حالات سے نمٹنے کیلئے مکمل تیار ہو کر آئے تھے۔ انہیں واضح طور پر ہدایت دی گئی تھی کہ گاؤں میں داخلے سے روکنے والی ہر مزاحمت کو سختی سے کچل دیا جائے۔ انہوں نے اپنے اسلحوں کا رخ گاؤں کی طرف کر کے فائرنگ شروع کر دی۔ مخالف سمت سے اینٹ پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ بالکل ناہموار مقابلہ تھا۔ لیکن ایسا اکثر ہوتا ہے۔ عشق جب جنون کی سرحد میں داخل ہو جائے تو کاندھوں پر موجود سروں کی پروا کون کرتا ہے؟

اچانک ادھر سے آئی ہوئی ایک گولی نجم النسا کے جسم میں پیوست ہو گئی۔ وہ لہرائی تو اس کے عقب میں موجود شمس الدین شیخ نے اس کے جسم کو اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا اور اسے کھینچ کر پیچھے گولیوں کی زد سے دور لے گیا۔ اس نے نجم انسا کے خون آلود جسم کو دھیرے سے زمین پر لٹایا اور پکار اٹھا۔ ''نجم النسا......نجم النسا......''

نجم النسا نے قدرے توقف کے بعد آنکھیں کھولیں۔ اپنے چہرے پر جھکے ہوئے شمس الدین کو پہچانا اور پھر ٹوٹتی ہوئی آواز میں بولی۔

''آمی گرام چھیڑے جابونا۔ آما کے بابا رکا چھئی دفن کو ربے۔ آمی بابا کے چھیڑے جابونا''۔ ''(میں گاؤں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ مجھے بابا کے پاس ہی دفن کرنا۔ میں بابا کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی)

اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ شمس الدین شیخ نے اس کے بے جان چہرے کو تکتے ہوئے گہرے کرب اور بے چارگی سے سوچا۔

نجم النسا تو اپنی موت کے بعد بھی اپنی زمین، اپنے بابا کے ساتھ رہ گئی۔ لیکن کیا اس کے بچے اپنی زمین، اپنی ماں کے ساتھ رہ پائیں گے؟

☆☆☆☆☆☆
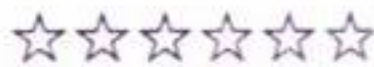
وہ مکمل نہیں مرتے
(سجاد ظہیر کے نام)

میں باتھ روم سے فریش ہو کر باہر آیا تو دیکھا کہ وہ کمرے کی اکلوتی کرسی پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ ہر چند کہ دروازہ کھلا تھا لیکن یوں بلا اجازت کسی کے گھر میں داخل ہو جانا انتہائی غیر اخلاقی حرکت تھی۔ میں نے کچھ سخت الفاظ کہنے کیلئے لب وا کیے ہی تھے کہ انہوں نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ سرخ و سپید باوقار چہرہ، بالوں کی عدم موجودگی کے سبب کچھ اور کشادہ ہوگئی روشن پیشانی اور گہری بے تاب نگاہوں میں ذہانت کی تیز چمک۔ میں چشم زدن میں انہیں پہچان گیا۔ کل ہی اخبار میں ان کی تصویر نمایاں طور پر شائع ہوئی تھی اور ایک خصوصی مضمون میں ان کی حیات کے روشن پہلو اجاگر کئے گئے تھے۔ وہ ایک بڑے ادیب، دانشور اور ملک میں ایسی انقلابی تحریک کے بانی تھے جس نے ہر دھڑکتے ہوئے تغیر پسند دل کو اسیر کر لیا تھا۔ ہر وہ نوجوان جو سماجی نابرابری اور ظلم واستحصال کی آبیاری سے نالاں تھا، ان کی تحریک سے وابستہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے تحریر و عمل کے ذریعہ بڑی جدو جہد کی تھی اور لوگوں کی ذہن سازی میں اپنی عمر صرف کر دی تھی۔ نتیجہ بھی خاطر خواہ نکلا تھا اور اہل علم و دانش کا بڑا طبقہ ان کے نظریات کا حامی ہو چکا تھا۔

اس وقت ایک سرکاری ادارے کی جانب سے ان کے اعزاز میں سہ روزہ قومی اجلاس جاری تھا لیکن حیرت انگیز طور پر وہ یہاں تشریف فرما تھے۔

"آپ یہاں ...... میں نے حیرانی ظاہر کی۔" آپ کو تو اپنے اعزازی اجلاس میں حاضر رہنا چاہیئے تھا جہاں ملک بھر سے سینکڑوں مندوبین جمع ہوئے ہیں جو آپ پر گلہائے عقیدت و تحسین برسانے والے ہیں"۔

انہوں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں اور پھر تھکے ہوئے لہجے میں گویا

ہوئے۔

''جانے کیسے پھول تھے؟ بالکل مصنوعی اور بے رنگ۔ ان کی ایسی سال خوردہ اور سیلن بھری بو تھی کہ دم ہی گھٹنے لگا تھا۔ میں سب کی نظریں بچا کر باہر نکل آیا۔ اتفاق سے تمہارا ہی دروازہ کھلا ملا تھا اور میں بے خیالی میں ہی اندر داخل ہو گیا''۔

''لیکن میں وہاں کی طرح آپ کی خاطر تواضع نہیں کر سکوں گا۔ مہینے کے آخری دن ہیں۔ بالکل قلاش ہو رہا ہوں''۔ میری صاف گوئی پر ان کے پتلے سرخ ہونٹوں پر نرم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہاں ایک پیالی چائے مل جاتی تو بہتر تھا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا ہے''۔

''لیکن دودھ بھی نہیں ہے''۔ اس بار اپنی حقیقت بیانی پر مجھے قدرے شرمندگی ہوئی۔

''کوئی بات نہیں۔ چائے پتی اور چینی تو ہو گی۔ مجھے تو بغیر دودھ کی چائے ہی پینے کی عادت ہے''۔

میں نے زنگ آلود اسٹو جلایا اور کٹورے میں پانی چڑھا دیا۔ کچھ ہی دیر میں پانی ابلنے لگا تو میں نے چائے پتی اور چینی اس میں ڈال دی۔ چائے تیار ہو گئی۔ چائے کے گرم گھونٹ لیتے ہوئے انہوں نے دریافت کیا۔ ''تم کیا کرتے ہو''؟

''ملک کی سب سے بڑی موبائیل کمپنی کے کال سنٹر میں ملازم ہوں''۔

''موبائیل!'' انہوں نے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا تو مجھے ان کی لاعلمی کا ادراک ہوا اور میں دھیرے سے ہنسا۔

''آپ موبائیل کے بارے کیا جانیں؟ آپ کے وقت میں تو اس کا وجود بھی نہیں تھا۔ بس یوں سمجھیں کہ ٹیلی فون بے جواب ہر جیب میں منتقل ہو گیا ہے۔

''اوہ!'' ان کی آنکھوں سے ہلکی سی بے یقینی مترشح ہوئی۔ ''زمانہ بے حد ترقی کر گیا ہے''۔

''کیا آپ جانتے ہیں''؟ میں نے فخر آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہماری موبائیل کمپنی کے مالک دنیا کے امیر ترین شخص ہو گئے ہیں''۔

''اچھا!'' ان کی آنکھوں میں مسرت کے جگنو چمکے۔ ''لگتا ہے ہمارے ملک نے تیز رفتار ترقی کی ہے۔ لوگ بہت خوشحال ہو گئے ہیں۔ جانتے ہو میں نے ظلم و استحصال کے خلاف ایک تحریک شروع کی تھی۔ بیشتر تعلیم یافتہ اور ذی شعور افراد اس میں عملی طور پر شامل ہو گئے تھے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں اسی تحریک کے زیر سایہ پروان چڑھے ہوئے لوگ برسوں سے بر سر اقتدار ہیں''۔

''ہاں! اسی تحریک کے حامیوں کی سرکار ہے جسے مزدور کسان کے علاوہ فن کاروں، قلم کاروں اور دانشوروں کی حمایت بھی حاصل ہے۔ ہر سو اسی تحریک کا اختیار ہے''۔ جانے کیوں میرے لہجے میں کسی قدر طنز کا عنصر گھل آیا تھا لیکن انہوں نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ ان کے چہرے کی چمک میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے اطمینان کی گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''چلو! ہماری بے لوث جد و جہد کہیں تو بار آور ہوئی۔ کیا تم کچھ دیر کیلئے میرے ساتھ کھلی ہوا میں چل سکتے ہو۔ آج بہت حبس ہے''۔

یہ تو گلے ہی پڑ گئے۔ میں نے پریشانی سے سوچا۔ لیکن ان کی شخصیت میں جانے کیسا سحر نہاں تھا کہ ان کی بات سے انکار کرنا مشکل تھا۔

''میں سرکاری ملازم تو ہوں نہیں۔ نجی کمپنی کی ملازمت ہے۔ ذرا سی تاخیر بھی برداشت نہیں کی جاتی۔ ویسے ابھی میرے پاس کچھ وقت ہے۔ چلئے''۔

وہ کرسی سے اٹھے تو ان کی درازیِ قد کا بھی اندازہ ہوا۔ انہوں نے سفید کرتے کی گرد جھاڑی۔ بغل میں رکھے جھولے کو بائیں کاندھے پر لٹکایا اور میرے ساتھ کمرے سے نکل آئے۔ باہر حسب معمول زندگی رواں دواں تھی۔ ایک جم غفیر تھا جو اپنی منتخب کردہ چھوٹی چھوٹی منزلوں کی سمت سرعت سے گامزن تھا۔ فلک بوس عمارتوں کے زیر سایہ چلتے ہوئے ہم لوگ بڑی سڑک پر نکل آئے سڑکوں پر جدید ماڈل کی دوڑتی ہوئی گاڑیوں کو ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''یہاں ایسی رکشائیں چلتی تھیں جنہیں آدمی کھینچتے تھے۔ وہ نظر نہیں آتیں''۔

''پچھلے دنوں سرکار نے ان پر پابندی لگادی''۔ میں نے لاپرواہی سے کہا۔

چلو! اچھا ہوا۔ آدمیت کی ایسی تذلیل دیکھ کر مجھے ہمیشہ دکھ ہوتا تھا''۔

میں جواب دیئے بغیر خاموشی سے ان کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ مسرت آمیز حیرت سے شہر کی تبدیلی اور ترقی کو دیکھتے رہے۔ اچانک سامنے سے ایک جلوس کو آتے دیکھ کر وہ ٹھہر گئے۔ مجبوراً مجھے بھی ٹھہرنا پڑا۔ جلوس نزدیک سے گزرنے لگا تو ان کی آنکھوں میں استعجاب کی پرچھائیاں نمایاں ہوتی گئیں۔

''یہ لوگ تو برسراقتدار حکومت اور جماعت کے خلاف نعرے لگارہے ہیں''۔

''یہ جلوسوں کا شہر ہے''۔ میں نے انہیں بچوں کی طرح سمجھانے کی کوشش کی۔ ''یہاں تو لوگ احتجاج کے مواقع تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ذرا سا خلاف مزاج کوئی واقعہ رونما ہوا کہ جلوس لے کر نکل پڑے''۔

''لیکن اس جلوس میں بہت سارے ایسے چہرے بھی نظر آرہے ہیں جو ہماری تحریک میں پیش پیش تھے۔ اپنی ہی حکومت میں ان پر کیا افتاد آپڑی کہ انہیں سڑکوں پر اترنا پڑا''۔ انہوں نے تذبذب میں کہا تو میں نے بے زاری ظاہر کی۔

''چھوڑیئے بھی! مجھے جلدی ہے۔ آپ تھوڑا اور گھوم لیں اور پھر مجھے اجازت دیں''۔

وہ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا میرے ساتھ چل پڑے۔ شاید وہ یہاں کے موجود حالات سے بالکل ناآشنا تھے۔ انہیں بتاتا بھی کون؟ ان کی اعزازی تقریب میں شاید ہی کسی کی زبان پر اس ناخوشگوار سانحے کا ذکر آیا ہو جو گزشتہ دنوں قریب کے ہی ایک گاؤں میں پیش آیا تھا۔ مکمل سرکاری پشت پناہی میں ہونے والے خون ریز معرکے کی مخالفت میں دو روز تک شہر کا نظام زندگی مفلوج رہ چکا تھا۔ ٹیلی ویژن کی نشریات سے عیاں ہوتا تھا کہ وہاں درجنوں افراد ہلاک ہوئے تھے اور سینکڑوں زخمی حالت میں ہسپتالوں میں پڑے تھے۔ ریاست کے حکمراں اپنی جماعت کے لوگوں کے ذریعہ برپا کیے جانے والے ظلم وتشدد کو جائز اور درست ردعمل قرار دے رہے تھے اور نیرو کی طرح انسانیت کی لاش پر بانسری بجا رہے تھے۔ مخالف جماعتوں کا احتجاج تو فطری امر تھا لیکن ان لرزہ خیز واقعات پر ان کی

تحریک سے وابستہ افراد بھی، جن کا تعلق فنون لطیفہ کی مختلف شاخوں سے تھا، بری طرح دل برداشتہ اور برافروختہ تھے اور اپنے قول و عمل کے ذریعہ لوحِ تاریخ پر اپنا پرزور احتجاج درج کرار ہے تھے۔

ابھی کچھ ہی فاصلہ طے پایا تھا کہ ایک ہسپتال کے قریب خاصی بھیڑ دیکھ کر وہ ایک بار پھر رک گئے۔ ہم نے گردن اٹھا کر دیکھا کہ لوگ ایک مفلوک الحال اور بوسیدہ ساڑی میں ملبوس عورت کے گرد جمع تھے۔ سب سے آگے ذرائع ابلاغ کے افراد موجود تھے جن کے کیمرے کی آنکھیں اس عورت کے چہرے اور جسم کو قید کر رہی تھیں اور مائک اس کی آواز کو گرفت میں لینے کیلئے مستعد تھے۔ وہ عورت حالت ہیجان میں چیختی ہوئی فریاد کناں تھی۔ اس عورت کا تعلق اسی بدنصیب گاؤں سے تھا جہاں سرکار کے ذریعہ زمین کی جبراً حصولیابی کی خاطر قیامت صغریٰ برپا کی گئی تھی۔ اس کی دل خراش روداد سن کر سبھی کی زبانیں گنگ ہوگئی تھیں۔ وہ عورت اجتماعی زنا بالجبر کی شکار ہوئی تھی۔ درندگی کی انتہا تو یہ تھی کہ اس کی وحشت زدہ نگاہوں کے سامنے ہی اس کی دو نابالغ بچیوں کو بھی اس شرمناک اذیت سے گزرنا پڑا تھا۔ اس عذاب کے بعد دونوں بچیاں جانے کہاں غائب کردی گئی تھیں۔ پتہ نہیں زندہ بھی تھیں یا نہیں اور یہ سب سرکار کی شہ اور اشارے پر اس کی جماعت کے سرگرم کارکنوں کے ذریعہ ہوا تھا۔ اس مظلوم اور استحصال زدہ عورت نے ٹی۔ وی کیمرے کے سامنے اس درندگی میں شامل ایک ایک فرد کے نام بتائے تھے۔ ڈاکٹروں نے اس کی اجتماعی آبروریزی کی تصدیق کردی تھی۔ شک وشبہ کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ میڈیا کے استفسار پر اس عورت نے گاؤں میں ہونے والے ظلم و بربریت کی وہ خونچکاں داستان سنائی کہ انسانیت لرز اٹھی۔ کوئی ذی ہوش شخص تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ اس مہذب سماج میں ایسی حیوانیت ممکن ہے۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ بے حد ادبی اور مہذب گھرانے سے تعلق رکھنے والے جمہوری حکمراں مکمل آمرانہ رعونت کے ساتھ اس پورے شیطانی عمل کی حمایت کررہے تھے اور ان کے سپہ سالار فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے اپنی جماعت کے ان بہادروں پر گلباری کر رہے تھے جو معصوموں کے قتل کے ساتھ بے بس لاچار عورتوں کی اجتماعی عصمت دری میں بھی ملوث تھے۔

وہ ساکت و جامد ہجوم کے عقب میں کھڑے تھے۔ شاید انہیں یقین ہی نہ آرہا تھا کہ ظلم و

استحصال کے خلاف نبرد آزما ان کی تحریک سے فکری ونظریاتی وابستگی رکھنے والے افراد نے یہ تمام وحشیانہ فعل انجام دیا ہو۔ میں نے انہیں کھینچتے ہوئے بے حسی سے کہا۔

''اب چلئے بھی۔ یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ وقتی ابال تھا۔ اب تو ٹھنڈا بھی پڑ گیا''۔

وہ خالی ویران آنکھوں سے مجھے تکتے رہے۔ قدرے توقف کے بعد جیسے وہ کسی اہم فیصلے پر پہنچ کر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''تم جاؤ۔ میں اس گاؤں میں جا رہا ہوں جہاں جبر واستبداد کا یہ برہنہ رقص ہوتا رہا ہے۔ وہاں میری ضرورت ہے''۔

''آپ کی ضرورت تو اس سرکاری تقریب میں ہے جو آپ کے اعزاز میں منعقد کی گئی ہے''۔ میں نے یاددہانی کرائی۔

''وہاں میری موجودگی کی کیا ضرورت''؟ انہوں نے گہری بے زاری سے کہا۔ ''وہاں تو میری بے جان تصویروں سے بھی کام چل جائے گا''۔

وہ چلنے کو تیار ہوئے تو میں نے قدرے کھیج بھرے انداز میں کہا۔

''آپ جیسے لوگوں کا المیہ ہے کہ آپ کبھی مکمل نہیں مرتے۔ کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی شکل میں دوبارہ جی اٹھتے ہیں اور ہم جیسے پرسکون اور مطمئن لوگوں کیلئے مسائل پیدا کرتے رہتے ہیں''۔

☆☆☆☆☆☆
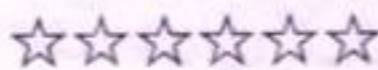
لکشمی پور کی شریفن

اکیسویں صدی کا سورج اگا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ سارے منظر بدل چکے ہیں۔ گلوبلائزیشن اور لبرلائزیشن کی جادوئی چھڑی سے سارا ملک بازار اور افراد خریدار میں تبدیل ہو گئے تھے۔ جو قوت خرید نہیں رکھتے تھے وہ خود کو فروخت کرنے پر مجبور تھے۔ ملک پر سرمایہ دار ترقی یافتہ ممالک کی جدید ترین اسلحوں سے لیس ملٹی نیشنل کمپنیوں نے یلغار کر دی تھی جن سے بری طرح شکست کھا کر زنگ خوردہ اور آرام طلب نیشنل کمپنیاں دھڑا دھڑ بند ہو رہی تھیں یا پھر فاتح کمپنیوں میں ان کی شرطوں پر ضم ہو رہی تھیں۔ بڑی کمپنی ہو یا چھوٹا تاجر، افسر ہو یا مزدور، اپنی بقا اور اضافہ شدہ مصنوعی ضرورتوں کی تکمیل کے مد نظر کچھ نہ کچھ سائیڈ بزنس کرنے لگے تھے۔ گاڑیاں بنانے والی مشہور کمپنی ٹاٹا، سائیڈ میں نمک بنانے پر اتر آئی تھی تو منا پان والا سائیڈ میں کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں اور بھانگ کی گولیاں رکھنے لگا تھا۔ ادیب ادب کے علاوہ سرکاری ایجنڈے کو آگے بڑھانے میں لگ گئے تھے تو صحافی صحافت کے ساتھ بلیک میلنگ کو سائیڈ بزنس کے طور پر اپنا بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر نقلی دواؤں کا بغلی دھندہ کرنے لگے تھے تو اساتذہ کورس کی کتابوں کی دکان کھول بیٹھے تھے۔

پشتینی کام روایتی انداز سے کرنے والے جدید تقاضوں سے نبرد آزما مات پر مات کھا رہے تھے۔ سبسڈی کم ہو جانے کے باعث کسان اپنی فصل کی لاگت وصول نہیں کر پا رہے تھے اور قرض خواہوں سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ مزدور دوست جماعت کا وزیر اعظم پانچواں پے کمیشن لاگو کر کے قومی خزانے کو بے ایمان سرکاری افسروں کی کبھی نہ بھرنے والی جیب میں انڈیل چکا تھا اور مزدور اپنی پھٹی جیب لیے حسرت آمیز حیرت میں مبتلا تھے۔ دیش بھگت جماعت کا وزیر اعظم ملک کی منافع بخش کمپنیوں کو اونے پونے دام میں فروخت کرنے پر تلا تھا اور ان سے ملنے والی رقم کو دشمن ملک کے حکمراں کی شاہی مہمان نوازی پر صرف کر رہا تھا۔ پورا ملک ایک

منڈی بن چکا تھا جس میں دلالوں کی بن آئی تھی۔ ہرشد مہتا اور کیتن پارکھ جیسے دلال شیئر بازار کو لوٹ چکے تھے تو دلیش بھگت جماعت کا صدر دفاعی سودے کی دلالی کھاتے ہوئے ٹی وی کیمرے سے فوٹو کھنچوا رہا تھا۔ سرکار اپنی فنانس کمپنی میں عام آدمیوں کی جمع پونجی دلالوں کی معرفت بڑے لیڈروں سے لٹوا چکی تھی۔

ٹی وی پروگراموں کے ذریعہ لوگوں کو ایک مصنوعی دنیا اور تہذیب سے متعارف کرایا جا رہا تھا اور ان میں دکھائے جانے والے اشتہاروں میں چیزوں کی اصلیت کہیں گم کر دی گئی تھی۔ اشتہاری دباؤ کے تحت مٹی سونے کے نرخ پر فروخت کی جا رہی تھی اور ''اس کی ساری میری ساری سے سفید کیوں'' کے سوال کو حل کرنے کی کوشش میں ہر چہرہ سیاہ پڑتا جا رہا تھا۔ پردۂ سیمیں کا باغی نوجوان ادھیڑ عمری میں چھوٹے پردے پر ''کون بنے گا کروڑ پتی'' کے ذریعہ نئی نسل کو جوئے کی ترغیب دینے لگا تھا اور کرکٹ کے ہیرو سٹے بازوں سے ملک کے وقار کا سودا کرنے لگے تھے۔

کیبل ٹی۔وی کے ذریعہ گھر گھر میں بلو فلمیں دیکھی جا رہی تھیں اور کمپیوٹر کے مانیٹرس پر ننگی لڑکیاں دلبستگی کے سامان فراہم کر رہی تھیں۔ اسکولوں میں سیکس ایجوکیشن کے بارے میں سرکار اب تک فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی اور اسکولوں کے کم سن طلبا و طالبات سیکس کا پریکٹکل کورس کرنے لگے تھے۔ ناجائز بچے اب کوڑے دان میں نہیں پھینکے جا رہے تھے بلکہ جائز طریقے سے انہیں حمل میں ہی ختم کروایا جا رہا تھا۔ ساکشرتا ابھیان کے تحت تمام بوڑھی بوڑھے اپنا نام لکھنا پڑھنا سیکھ گئے تھے اور ان کی تعلیم یافتہ اولادیں ان کا نام تک بھول چکی تھیں۔ گاؤں کے گاؤں خالی ہو رہے تھے اور شہر کے فٹ پاتھوں پر بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ اغوا مقبول ترین دھندا بن چکا تھا اور قتل ٹھیکے پر کیے جانے لگے تھے۔ دولت اور تعلیم تیزی سے برآمد ہو رہی تھیں اور بھوک اور بے حیائی اس سے دوگنی تیزی سے در آمد کی جا رہی تھیں۔

لیکن شہر سے ملحق گرانڈ ٹرنک روڈ کے کنارے واقع رنڈی پاڑا لکشمی پور کی شریفن بائی ان سارے بدلے ہوئے منظر سے بالکل بے خبر تھی۔ بھرے بھرے جسم اور کھردری زبان والی شریفن بائی اپنے ڈیرے کے باہری کمرے میں چوکی پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔

اندر کے کمروں میں اٹھنے والی آوازوں سے عیاں تھا کہ وہاں 'جاگ' ہوگئی تھی۔ یوں بھی صرف دو ہی گاہک رات بھر رکے تھے۔ باقی چھوکریاں گاہکوں کا انتظار کرتے کرتے ہی تھک کر سو گئی تھیں۔ شریفن بائی اپنے دھندے پر بہت دنوں سے چھائی ہوئی مندی سے بے حد متفکر تھی۔ لیکن اس وقت وہ اپنے دھندے کے بارے میں نہیں بلکہ سلمٰی سے متعلق سوچ رہی تھی۔ سلمٰی کل ہی ممبئی سے آئی تھی اور اس نے آج یہاں آنے کا سندیسہ بھیجا تھا۔ شریفن بائی تو خاندانی رنڈی تھی جب کہ سلمٰی اپنے شرابی باپ سے تنگ آ کر ایک نٹھلے مردوے کا ہاتھ تھامے ہوئے اس پاڑے میں پہنچی تھی۔ وہ مردوا تو اپنی جیب گرم کر کے چمپت ہوگیا اور سلمٰی اس ڈیرے کی ملکیت ہو کر رہ گئی۔ شروع شروع میں تو وہ پیشہ کرنے میں بے حد گھبرائی لیکن پھر اس نے ایسے کل پرزے نکالے کہ شریفن بائی خاندانی اور تجربہ کار رنڈی ہونے کے باوجود اس کی قائل ہوتی گئی۔ وہ تھوڑی پڑھی لکھی بھی تھی اس لئے گفتگو میں سلیقہ اور انداز میں رکھ رکھاؤ تھا۔ حالانکہ اس وقت شریفن بھی گدرائے جسم والی نوجوان چھوکری تھی لیکن اس کی طرح مردوں کو موہ لینے والی صلاحیت اس میں نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دل ہی دل میں اس سے پرخاش رکھنے لگی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح یہاں سے دفع ہو۔ لیکن سلمٰی تو خود ہی اونچی اڑان کیلئے پر تول رہی تھی۔ اس کا ایک مستقل گاہک تھا۔ مقصود بھائی۔ وہ تھا تو اسی شہر کا لیکن کچھ دنوں سے ممبئی شہر میں جا کر جانے کیا کرنے لگا تھا۔ اس نے جانے کون سی پٹی پڑھائی کہ وہ اس کے ساتھ ممبئی بھاگ نکلی۔

تقریباً سال بھر بعد وہ آئی تو اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدلے ہوئے تھے۔ اس کے انگ انگ سے امارت اور رعونت ٹپک رہی تھی۔ وہ شریفن سے بھی ملنے آئی لیکن اس نے منہ نہیں لگایا تو خفا ہو کر چلی گئی۔ اس کے بعد وہ ہر چوتھے پانچویں مہینے یہاں آتی۔ پاڑے میں موجود چھوکریوں میں سے چار پانچ کو منتخب کرتی، ان کی بائیوں کو دس بیس ہزار روپے پکڑاتی اور ان چھوکریوں کو لے کر ممبئی روانہ ہو جاتی۔ شریفن نے اس سے کبھی پوچھا تو نہیں لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ مقصود بھائی کے ساتھ مل کر ان چھوکریوں کو دبئی کے ہوٹلوں میں سپلائی کرتی ہے۔ برسوں سے یہ سلسلہ چل رہا تھا اور آج بھی جاری تھا۔

دروازے پر کار رکنے کی آواز سنائی دی تو شریفن بائی نے چونک کر باہر دیکھا۔ ماروتی کار تھی جس کا عقبی دروازہ کھول کر سلمیٰ کسی سیٹھانی کی طرح نیچے اتر رہی تھی۔ وہ نہایت قیمتی بنارسی ساری میں ملبوس تھی اور اس کے تمام جسم پر سونے کے بھاری زیوارات سجے تھے۔ وہ تمکنت سے چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو نہ چاہتے ہوئے بھی شریفن نے چوکی سے اتر کر اس کا استقبال کیا۔ سلمیٰ اپنی ساری کو سمیٹتی ہوئی چوکی پر ہی بیٹھ گئی۔

''کیسی ہو شریفن''؟ اس کے لہجے میں خلوص و محبت کی ایسی گرمی تھی کہ شریفن یک لخت پگھل گئی۔

''بس گزر رہو رہی ہے۔ تم اپنی سناؤ۔ تمہارے کیا حال ہیں؟'' شریفن کے لہجے کی یاسیت سلمیٰ سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''میں تو بے حد مزے میں ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ میں نے مقصود سے شادی کرلی ہے۔ دو بچے ہیں۔ دونوں کو شملہ کے انگریزی اسکول میں داخل کروادیا ہے۔ وہیں ہوسٹل میں رہتے ہیں۔ لیکن تم کچھ دکھی سی لگ رہی ہو۔ کیا بات ہے''؟

''کچھ نہیں ...... وہی دھندے کا رونا...... شریفن ایک بار پھر پاندان کے پاس بیٹھ کر سروتے سے چھالیاں کترنے لگی تھی۔ ''تم تو اس ڈیرے میں رہ چکی ہو۔ گاہکوں کی کیسی ریل پیل رہتی تھی۔ ہر ایک کو ایک رات میں چھ سات کو نپٹانا پڑتا تھا۔ آج میرے پاس دس چھوکریاں ہیں۔ سبھی حسین اور جوان۔ لیکن گاہکوں کا ایسا ٹوٹا پڑا ہے کہ جان کے لالے پڑ گئے''۔

''کیوں؟ کیا پولیس کچھ زیادہ ہی پریشان کر رہی ہے''؟ سلمیٰ نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں ری۔ وہ بے چارے تو خود رو رہے ہیں۔ گاہک پیچھے دس روپے بندھے ہیں۔ اب گاہک آئیں تب نا ان کی بھی کمائی ہو''۔

شریفن نے پان لگا کر گلوری اسے پیش کی تو سلمیٰ نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''نہیں، میں تو پان پراگ گٹکا کھاتی ہوں''۔ اس نے اپنے پرس سے پان پراگ کا ڈبہ نکالا اور

کچھ مقدار اپنی ہتھیلی پر رکھ کر پھانک گئی۔ ''ممبئی جیسے بڑے اور تیز رفتار شہر میں پان لگانے اور کھانے کا اہتمام کون کرے۔ فاسٹ زندگی میں ہر شئے فاسٹ ہوتی جا رہی ہے۔ فاسٹ فوڈ، فاسٹ جرنی فاسٹ تھنکنگ...... ہاں تو پھر گاہک نہ آنے کی کیا وجہ ہے''؟

''تمہیں تو معلوم ہے کہ ہمارے زیادہ تر گاہک ٹرک ڈرائیور تھے۔ سرکار نے بائی پاس سڑک بنا کر ادھر سے بڑی گاڑیوں کے گزرنے پر پابندی لگا دی۔ پھر بھی وہ آتے ضرور...... لیکن سنتی ہوں کہ بائی پاس کے کنارے تھوڑی تھوڑی دوری پر گاؤں دیہات کی لڑکیاں اور عورتیں جھنڈ بنا کر کھڑی رہتی ہیں۔ سالے ڈرائیور انہیں ٹرک پر ہی اٹھا لیتے ہیں اور بدن بھنبھوڑ کر دس بیس تھما کر راستے میں اتار دیتے ہیں۔ اب اتنے کم پیسوں میں راہ چلتے عورتیں مل جاتی ہیں تو وہ ادھر کا رخ کیوں کریں''؟

''گاؤں دیہات کی حالت بے حد خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اخباروں میں پڑھتی ہوں کہ فصل اچھی ہونے کے باوجود کسان قرض کے جال میں پھنسے بھوکوں مر رہے ہیں۔ بھوک آج ان کی عورتوں کو سڑک پر لے آئی ہے کل وہ خود سڑک پر اتر آئیں گے...... لیکن کیا اب تمہارے پاس شہر کے لوگ نہیں آتے؟ وہ لوگ تو اچھا خاصا پیسہ لٹا جاتے تھے''۔

''ان کے نہ آنے کی وجہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ سامنے سڑک پر جتنی قیمتی کاریں اور موٹر سائیکلیں دوڑتی ہیں، شہر میں جتنے دو منزلہ، سہ منزلہ عالیشان مکان بننے لگے ہیں، ان سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ خوب دولت کما رہے ہیں۔ لیکن پتہ نہیں یکا یک سارے مرد شریف کیسے ہو گئے کہ ادھر جھانکتے ہی نہیں''۔

''مرد اور شریف!...... سلمیٰ حقارت سے ہنسی۔ ''ان کی شرافت دیکھنی ہو تو کبھی میرے ساتھ ممبئی چلو''۔

اچھا چھوڑو ان باتوں کو...... تم بتاؤ! اتنے دنوں بعد میرے یہاں کیسے آنا ہوا؟ شریفن نے پوچھا تو سلمیٰ قدرے توقف کے بعد بولی۔

''تم تو جانتی ہی ہوگی میرے اور مقصود کے کاروبار کو۔ ہم لوگوں نے ممبئی میں ''ورکرس

سپلائی ایجنسی'' کھول رکھی ہے۔ ہمارے بہت سارے ایجنٹ ہیں جو مختلف جگہوں سے غرض مند لڑکیوں کو لاتے ہیں۔ ہم لوگ ان کے پاسپورٹ اور ویزے بنوا کر انہیں دبئی کے ہوٹلوں میں عارضی مدت کیلئے سپلائی کر دیتے ہیں۔ ہوٹلوں میں انہیں بظاہر تو خادماؤں کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے لیکن ان کا اصلی کام گاہکوں کو جنسی تسکین پہنچانا ہوتا ہے۔ تمہارے پاس ڈھیر ساری چھوکریاں ہیں۔ چار پانچ مجھے سونپ دو۔ ہر چھوکری کے دس پندرہ ہزار دے دوں گی۔ دو تین مہینے میں پچاس ساٹھ ہزار کما کر وہ سب تمہارے پاس لوٹ آئیں گی''۔

''نا بابا نا! شریفن کانوں پر ہاتھ رکھتی ہوئی بولی۔'' وہاں کے مرد عورتوں کے ساتھ جانور جیسا سلوک کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں رکمنی آئی ہے۔ تم ہی لے گئی تھیں۔ وہاں ہفتے بھر تک کسی نرسنگ ہوم میں بھرتی رہی تھی۔ سنا ہے کہ دو تین ٹانکے بھی لگے''۔

سلمٰی قدرے تلخی سے ہنسی۔'' وہاں کے مرد ہوں یا یہاں کے۔ خریدی ہوئی عورتوں کے ساتھ بھی جانوروں کی طرح پیش آتے ہیں۔ ہاں! یہاں کے مردوں کے مقابلے میں وہ لوگ کچھ زیادہ ہی سیکسی اور مضبوط ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر رنڈیاں تو ایسے مردوں کو پسند کرتی ہیں۔ تم اپنی جوانی بھول گئیں۔ چار چار کو پار لگانے کے بعد بھی بھوکی بلّی بنی رہتی تھیں''۔

اس نے شریفن کے سراپے کو رشک آمیز نظروں سے تکا اور پھر شریری مسکراہٹ کی ساتھ بولی۔

''اور اب بھی کون سی بوڑھی ہو گئی ہو؟ تمہارا بدن تو ابھی تک تان پورے کی طرح کسا ہوا ہے۔ کیا اب گاہکوں کو نہیں نپٹاتی ہو''؟

سلمٰی کی باتوں سے شریفن کے چہرے پر سرخی کی ہلکی سی پرت چڑھ گئی۔ آنکھیں قدرے نشیلی اور سانسیں بھاری ہو گئیں۔ شرمیلی ہنسی بکھیرتی ہوئی وہ کچھ کھسیانی سی بولی۔'' یہاں تو جوان چھوکریوں کو ہی مرد پورے نہیں پڑتے۔ ہاں کبھی کبھی کوئی پرانا یار چلا آتا ہے اور ضد پکڑ لیتا ہے تو بات رکھنی پڑتی ہے۔ تم خود کبھی دبئی گئی ہو''؟

''کئی بار''۔ سلمٰی نے بے شرمی سے آنکھیں مٹکائیں۔'' وہاں کے مردوں کے بارے میں

ذاتی تجربہ ہی بتا رہی ہوں۔ تو پھر کیا خیال ہے؟ لڑکیوں کو میرے ساتھ بھیجوگی''؟ سلمٰی پھر اپنے مقصد پر لوٹ آئی۔

''من نہیں مانتا۔'' شریفن کے لہجے میں تھوڑی سی کشمکش تھی۔ ''پردیس کا معاملہ ہے۔ کچھ اونچ نیچ ہوگئی تو جی کچوٹتا رہے گا''۔

''تم خواہ مخواہ فکرمند ہوتی ہو۔'' سلمٰی نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''تین چار مہینوں کی تو بات ہے۔ وہاں اچھی رقم ملے گی اور کام کا بھار بھی کچھ نہیں۔ ہفتے میں صرف جمعے کے روز زیادہ مصروفیت رہتی ہے۔ وہاں جمعے کو عام چھٹی ہوتی ہے اس لئے دور دور سے لوگ عیش کرنے چلے آتے ہیں۔ ہوٹلوں کے سارے کمرے بک ہو جاتے ہیں اور ہر کمرہ عیش گاہ بن جاتا ہے۔ ان کے پاس دولت کی تو کمی ہے نہیں۔ چھوکریوں کی سمجھداری پر منحصر ہے کہ انہیں خوش کر کے کتنی اوپری آمدنی کر لیتی ہیں۔ یوں تو گاؤں گرام کی سیدھی سادی لڑکیاں بہت سی مل جاتی ہیں لیکن پیشہ ور رنڈیوں کی بات ہی کچھ اور ہے''۔

شریفن بائی پُر خیال انداز میں خاموشی سے چھالیہ کترتی رہی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور کسی جواب کا انتظار کئے بغیر ہی چار نوجوان اندر داخل ہوگئے۔ شریفن نے چونک کر انہیں دیکھا تو آگے والا نوجوان کسی قدر بدتمیزی سے بولا۔

''ارے بائی جی! تم تو یہیں چھپی بیٹھی ہو۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تمہاری دکان ہی بند ہوگئی''۔

شریفن بائی نے اپنے چہرے پر ابھر آنے والے ناگواری کے تاثرات کو پیشہ ورانہ مسکراہٹ تلے چھپایا اور لگاوٹ بھرے انداز میں بولی۔

''بہت دنوں بعد دکھائی دیئے۔ کہاں گم ہوگئے تھے''؟

''ہم تو اسی شہر میں ہیں''۔ وہ نوجوان آگے بڑھ کر صوفے پر پھیلتا ہوا بولا۔ ''دراصل ہم شریف گھروں کے لڑکے ہیں اس لئے اس بدنام علاقے میں آنے سے پرہیز کرنے لگے ہیں''۔

''تو کیا تم لوگ ہنومان جی کے بھگت ہوگئے ہو''؟ شریفن بائی ذرا تلخی سے بولی۔

''نہیں! ہم تو اب بھی حسن کے ہی پجاری ہیں لیکن پوجا کیلئے یہاں آنے کی ضرورت نہیں

پڑتی۔ شہر میں ہی بندوبست ہو جاتا ہے"۔

"کیا مطلب"؟ شریفن بائی اس کی باتوں سے چکرائی تو نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اسکول کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں ...... اور آفسوں میں کام کرنے والیاں ...... ان میں سے بہت سوں نے چوری چھپے تمہارے پیشے کو اپنا لیا ہے۔ کسی کو بھی فون گھماؤ ...... وہ طے شدہ وقت اور مقام پر حاضر ......

"تو پھر آج ادھر کیوں چلے آئے؟ شریفن بائی کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ اندر ہی اندر مشتعل ہو رہی ہے۔

"ارے بائی جی! آج سنڈے ہے نا۔ سبھی سالیاں اپنے گھروں میں قید ہیں۔ کچھ دوست آ گئے تو تفریح کرنے یہیں چلے آئے ...... لڑکیاں موجود ہیں نا"؟

"ہاں! وہ کہاں جائیں گی؟ تم لوگ ٹھہرو میں بلاتی ہوں"۔ اس نے ذرا زور سے آواز دی۔

"ریتا ریتا ...... اری او ریتا ......"

دوسرے ہی لمحے ایک جوان اور خوبصورت لڑکی اندورنی دروازے پر نمودار ہوئی۔ شریفن اسے مخاطب کرتی ہوئی بولی "انہیں بھیتر لے جاؤ!"

نوجوان نے کھڑے ہو کر پتلون کی جیب سے چند روپے نکالے اور شریفن بائی کے ہاتھ پر رکھ دئے۔ روپے گنتے ہوئے شریفن کی بھنویں سکڑ گئیں۔ "صرف دو سو ...... چاروں کے چار سو لگیں گے"۔

ارے بائی جی! تمہارے بھاؤ کب سے بڑھ گئے؟ پچاس روپے میں تو اس پاڑے میں اچھی سے اچھی لڑکی مل جائے گی"۔

اور وہ تمہاری اسکول کالج والیاں ...... "شریفن کا پارہ چڑھا۔ "ان پر پچاس ہی خرچ ہوتے ہیں؟ سو پچاس تو ناشتے پانی میں ہی اڑ جاتے ہوں گے۔ سو ڈیڑھ سو روم کا کرایہ لگتا ہوگا اور وہ دو ڈھائی سو سے کم کیا لیتی ہوگی؟

"ارے وہ شریف اور عزت دار گھرانوں کی لڑکیاں ہیں۔ ان کا اور تمہارا کیا مقابلہ"؟

''کیوں؟ کیا ان کے بدن سونے کے ہوتے ہیں یا ان میں ہیرے جڑے ہوتے ہیں۔
ان کے بدن بھی ویسے ہی گوشت پوست کے ہوتے ہیں جیسے ہماری لڑکیوں کے۔'' شریفن جیسے
لڑنے پر اتر آئی۔ نوجوان بھی اکھڑ مزاج ہی تھا وہ بھی برافروختہ ہو کر بولا۔

''تم جیسی رنڈیوں سے کون بحث کرے؟ تمہارے پاس آنے والا رنڈی باز ہی کہلائے گا
جب کہ ان کے ساتھ وقت گزارنے والوں پر کوئی انگلی تک نہیں اٹھاتا۔ تم تیار نہیں ہوتی ہو نہ سہی۔
یہاں اور بھی بہت ساری ہیں''۔ نوجوان نے شریفن کے ہاتھ سے روپے جھپٹے اور باہر نکلا چلا گیا۔
اس کے پیچھے دوسرے نوجوان بھی نکل گئے۔

سلمیٰ تمام واقعے کی خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی۔ ان کے جانے کے بعد اس نے شریفن
کے چہرے کو تکا جو ذلت کے شدید احساس سے تمتانے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے چہرے کی
تمتماہٹ زائل ہوتی گئی اور اس کی جگہ پر اداسی کی گہری پرت چڑھ گئی۔

''دیکھا ان لونڈوں کو......'' وہ سلمیٰ سے مخاطب ہوئی تو اس کی آواز میں رقت آمیز یاسیت
تھی۔ ''ایک لڑکی پر پانچ چھ سو روپئے لٹا دیں گے اور دوسرے کیلئے سو روپئے بھی نہیں نکلتے۔ آخر
دونوں میں کیا فرق ہے''؟ سلمیٰ نے شریفن کے مضمحل اور اداس چہرے کا غور سے جائزہ لیا اور پھر
ہمدردی بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔

''تم بے حد بھولی اور ناسمجھ ہو شریفن۔ تم اپنے خاندانی ڈیرے پر پرانے زمانے کی
روایتی رنڈی بنی بیٹھی ہو اور اسی پرانے ڈھنگ سے دھندہ کرنے پر بضد ہو۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ
زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ اس بدلے ہوئے تصنع پسند اور فیشن زدہ زمانے میں چیزیں اپنی اصلی شکل اور
نام کے ساتھ آسانی سے اور اچھی قیمت پر نہیں بکتیں۔ انہیں بیچنے کیلئے ان کی ظاہری شکل اور نام میں
پرکشش تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔ کیا کوئی تاجر مونگ پھلی کی کھلی مفت میں بھی لوگوں کو کھانے پر آمادہ
کرسکتا ہے؟ نہیں نا...... لیکن جب اسی کھلی کی شکل میں ذرا سی تبدیلی کر دی گئی اور دیدہ زیب پیکنگ
کر کے اس کا نام ہارلکس، رکھ دیا گیا تو لوگ صحت بخش غذا کے نام پر اسے دو سو روپئے کیلو تک میں
خرید رہے ہیں۔ آگ پر بھنا بھٹا کھانا گنوار پن ہے لیکن دو سو روپئے کیلو ''پاپ کارن'' کھانا اپر کلاس

فیشن میں شامل ہے۔ تین روپے کیلو آلو کوئی پوچھتا نہیں لیکن وہی آلو 'انکل چپس' کے نام سے تین سو روپے کیلو بک رہا ہے۔ چار آنے میں نیم کا داتن کرنا غیر مہذب ہونے کی پہچان ہے لیکن اسی نیم سے بنا قیمتی ٹوتھ پیسٹ اونچے گھرانوں میں فخریہ استعمال کیا جارہا ہے۔ دس آنے کا سوڈا پانی 'کوک' اور 'پیپسی' کے نام سے لوگ دس روپے میں دھڑا دھڑ خرید رہے ہیں۔

آج کے اشتہار گزیدہ اور خیرہ چشم لوگوں کیلئے چیزوں کی خوبصورت پیکنگ کے ساتھ تبدیل شدہ شکل اور نام کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر پیشے میں دور کی مانگ کے مطابق جدت کاری بے حد ضروری ہے۔ روایتی انداز میں پرانے طور طریقوں سے کام کرنے والے تمہاری طرح ہی اپنے دھندے میں ناکام ہوجائیں گے''۔

شریفن سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی۔ کچھ دیر ٹھہر کر سلمیٰ اپنی آواز میں شیرینی گھولتی ہوئی بولی۔

''میری مانو تو اپنی تمام لڑکیوں کو میرے حوالے کردو۔ ڈیڑھ دو لاکھ تو تمہیں مل ہی جائیں گے''۔

''کیا تم میرا مذاق اڑا رہی ہو''؟ شریفن تنتنا کر کھڑی ہوگئی۔ ''ڈیڑھ دو لاکھ کتنے دن چلیں گے؟ اس کے بعد بھوکی مروں گی''؟

''بھوکی کیوں مروگی؟'' سلمیٰ کا لہجہ اسی طرح شانت اور نرم تھا۔ ''میں نے کہا نا کہ آج چیزیں اپنی اصلی شکل اور نام کے ساتھ آسانی سے اور اچھی قیمت پر نہیں بکتیں۔ تم پڑھی لکھی نہیں ہو تو کیا ہوا؟ تجربہ کار تو ہو۔ کچھ نہیں تو ان پیسوں سے کسی اچھے کھاتے پیتے علاقے میں 'لیڈیز سلائی ٹریننگ سنٹر' ہی کھول لینا''۔

☆☆☆☆☆

ہانکا کرنے والے

مولوی احسان اللہ فجر کی نماز کے بعد مسجد سے نکلے تو ان کا رخ گھر کی بجائے اسٹیشن کی طرف تھا۔ ان کے کاندھے سے ایک چھوٹا سا سفری بیگ لٹک رہا تھا جس میں ایک جوڑے کپڑے کے علاوہ ضروریات کے کچھ چھوٹے موٹے سامان تھے۔ ماہ ستمبر کے ابتدائی ایام تھے لیکن فضا کی خنکی میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے چلتے چلتے اپنے ہاتھوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے گرمی کا احساس پیدا کیا اور ماحول پر طائرانہ نگاہیں دوڑائیں۔ حسب معمول چہار سمت سکون اور پاکیزگی کا سماں تھا۔ ہر گھر سے تلاوت کلام پاک کی دلپذیر صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ ان آوازوں کے سحر میں اسیر آگے بڑھتے رہے۔

گذشتہ پندرہ بیس برسوں کے دوران تمام ملک میں بتدریج ایک خوشگوار اور ایمان افروز انقلاب آیا تھا۔ مسلم جماعت، اصلاحی جماعت اور دیگر اسلامی جماعتوں کے علمائے کرام کی مسلسل اور بے لوث تبلیغ دین اور اصلاح معاشرہ سے ملک بھر میں ایک ایسی مذہبی بیداری آئی تھی جو اب واضح طور پر نظر آنے لگی تھی۔ جگہ جگہ دینی مدارس قائم ہوئے تھے جن میں قوم کے بچوں کو اسلام کے درست عقائد اور تشریحات کے ساتھ قران و حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ان مدارس کو ملک کے ارباب اقتدار کی سرپرستی حاصل تھی۔ بیرونی اسلامی ممالک کے سربراہان ملت کو بھی ان مدارس کی نیک خدمات کا اعتراف تھا اور وہ نہایت فراخدلی سے ان کی نشو و نما اور آبیاری میں معاونت کرتے تھے۔ خاص طور سے مرکز اسلامیہ اس اہم مذہبی کاز میں پیش پیش تھا۔ وہاں کی مثالی اسلامی حکومت صحیح اسلامی نظریات کے فروغ اور دینی عقائد و شعائر کی درستی و پختگی کے لئے پوری دنیا میں ایسے مدارس کی خوب حوصلہ افزائی کرتی تھی اور انہیں زبردست مالی و نظریاتی امداد فراہم کرتی تھی۔ ان کا قصبہ بھی اس روشن انقلاب سے محروم نہ رہا تھا۔ لوگ از سر نو دین کی طرف راغب ہوئے تھے اور

پورے جوش وخروش سے اس کی تبلیغ وتوسیع میں شامل ہو گئے تھے۔ نماز روزوں کی پابندی کے ساتھ تلاوت کلام پاک بھی کارحیات کالازمی جزو بن گئی تھی۔ جمعرات کی شب مسجدوں میں مجلسیں ہوتیں جہاں ایک دوسرے سے کلام پاک کی آیتیں سنی جاتیں۔ تجوید میں کچھ خامیاں ہوتیں تو انہیں درست کرایا جاتا۔ نمازوں کے صحیح طریقے اور مسائل سمجھے اور سمجھائے جاتے۔ رسول اکرم اور صحابہ کرام کے زریں خیالات اور واقعات بیان کئے جاتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی جاتی۔ مہینے دو مہینے میں اصلاح معاشرہ کے عنوان سے قصبے میں کوئی بڑا جلسہ ہوتا جس میں جلیل القدر علمائے کرام تقریریں کرتے جن کا اثر لوگوں کے ذہن ودل پر ہفتوں برقرار رہتا۔ نئے مدارس کھل گئے تھے جن میں قصبے کے بچے ذوق وشوق سے دینی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے۔ لوگ دنیائے بے ثبات کی چند روزہ کشش سے کنارہ کش ہو کر آخرت کی دائمی لذتوں کے حصول کے لئے کوشاں ہو گئے تھے۔

ان اسلامی جماعتوں کی بے شمار ذیلی تنظیمیں بھی قائم ہو گئی تھیں جو اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق تمام عالم میں مسلمانوں کے غلبہ کیلئے عملی طور پر مقدس جہاد میں مصروف ہو گئی تھیں۔ شروع میں تو ان تنظیموں کیلئے مجاہدوں کی فراہمی انہیں جماعتوں کے ذمے تھی بعد میں ان تنظیموں نے براہ راست بھی مجاہدوں کی بھرتی شروع کر دی تھی لیکن ان پر بہر حال انہیں جماعتوں کا تسلط قائم تھا اور وہ انہیں کی ہدایتوں پر عمل کرتی تھیں۔

مولوی احسان اللہ پلیٹ فارم میں داخل ہوئے تو وہاں موجود اکثر افراد نے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے نہایت خلوص دل سے ان کا جواب دیا اور ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ پہلے تو انہیں کوئی جانتا بھی نہ تھا لیکن جب سے ان کے دونوں بیٹے شہادت کی سعادت سے سرفراز ہوئے تھے، ان کی پہچان کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی ان کی عزت وتوقیر میں بھی زبردست اضافہ ہوا تھا۔ لوگ دور دراز سے ان سے شرف ملاقات حاصل کرنے آتے تھے وہ کوئی دینی مدرسے سے سند یافتہ مولوی نہیں تھے۔ انہوں نے بس ابتدائی تعلیم ہی حاصل کی تھی۔ لوگوں نے ازراہ عقیدت انہیں مولوی کا خطاب دے دیا تھا۔ تنظیم کی طرف سے وہ اکثر شہر بلائے جاتے جہاں وہ کسی مدرسے یا تربیتی کیمپ میں جہاد کیلئے داخل ہونے والے نئے لڑکوں کے سامنے اپنے

بیٹوں کی شہادت کی وہ ایمان افروز داستان سناتے جو تنظیم کے کمانڈران چیف نے عینی شاہدین کے حوالے سے سنائی تھی۔اس وقت بھی وہ تنظیم کی درخواست پر شہر جا رہے تھے۔

تقریباً سات آٹھ سال قبل ان کے گھر کچھ ایسے افراد آئے تھے جو اپنی وضع قطع کے اعتبار سے اسلامی مجاہدین ہی نظر آتے تھے۔ان میں سے ایک دراز قد، باریش اور باوقار نوجوان نے خود کو حرکت الناصرین کے کمانڈران چیف کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔وہ اس تنظیم کے نام سے اچھی طرح واقف تھے۔اس وقت جہاد میں مصروف وہی سب سے فعال اور بااثر تنظیم تھی۔انہیں مسرت آمیز حیرت ہوئی کہ اتنی عظیم المرتبت ہستی ان کے گھر تشریف لائی ہے۔انہوں نے انہیں خوش آمدید کہا۔تعارفی کلمات کے بعد کمانڈران چیف نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''ہم لوگ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا بابرکت پیغام لے کر آئے ہیں۔ہم مسلمان دنیا کے لہو ولعب میں مبتلا ہو کر فراموش کر بیٹھے ہیں کہ یہ دنیا ایک عارضی قیام گاہ ہے، ہماری حقیقی منزل آخرت ہے جہاں بلند مرتبہ پانے کیلئے اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہی واحد راستہ ہے۔ اللہ کا فرمان ہے کہ تمام عالم پر مسلمانوں کا تسلط ہوگا۔وہ وقت قریب آ پہنچا ہے۔اسی کے خوف سے تمام کفر والحاد کی باطل قوتیں متحد ہوگئی ہیں اور ہر جگہ مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے کی ناپاک کوششوں میں مشغول ہیں۔مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جا رہا ہے اور ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں۔مسلمان سرحدوں میں تقسیم قوم نہیں ہے۔دنیا کے کسی کونے میں مسلمان موجود ہو، وہ ہمارا دینی بھائی ہے اور اس کی جان و آبرو کی حفاظت تمام مسلمانوں پر فرض ہے ہم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تمام باطل قوتوں کے خلاف مسلح جہاد کا اعلان کر رکھا ہے۔اللہ کا فرمان غلط نہیں ہوسکتا۔بہت جلد پورے عالم پر مسلمان غالب اور حکمراں ہوں گے۔اس عظیم مقصد میں کامیابی کی خاطر ہر سچے مسلمان پر جہاد فرض ہے قران مجید کی سینکڑوں آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا ہے اور اس کی عظمت و برکت بیان کی ہے۔ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے دو بیٹے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ تم انہیں اللہ کی راہ میں جہاد کیلئے وقف کردو۔وہ اس کا اجر عظیم عطا فرمائے گا ۔ہم انہیں دینی تعلیم کے ساتھ عسکری تربیت بھی دیں گے۔اگر انہیں شہادت کی نعمت نصیب ہوگئی تو

جنت میں بلند مرتبے پر فائز ہوں گے اور ہر ایک کو اپنی شفاعت سے ستر رشتہ داروں کو جنت میں داخل کرانے کا اختیار ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے''۔

احسان اللہ ان کی شخصیت اور کلام سے بے حد مرعوب اور محصور ہو چکے تھے پھر بھی بیٹوں کے متعلق قدرے کشمکش میں پڑ گئے۔ انہوں نے نرمی سے جواب دیا۔''میں اس سلسلے میں ان کی والدہ سے بات کروں گا''۔

کمانڈران چیف کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرے اور انہوں نے خشک لہجے میں کہا۔''عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں۔ اہم معاملات میں ان سے مشورے نہ کیا کرو۔ سخت ممانعت ہے۔ اور پھر یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ کون مسلمان اس پر لبیک نہ کہے گا۔ انکار کی صورت میں وہ اللہ کے غیظ وغضب کا مستحق ہوگا۔ ہم نے اللہ کی نافرمانی کرنے والوں کی بھی فہرست بنا رکھی ہے''۔

احسان اللہ اللہ تعالیٰ کے نافرمان بندوں میں شمار ہونا قطعی نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے دونوں بیٹوں کو جن کی عمریں بالترتیب چودہ اور بارہ سال تھی، ان کے سپرد کر دیا تھا۔ مہینوں بعد ان کے بیٹوں کا خط آیا تھا جس میں انہوں نے تعلیم وتربیت پر اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ خط میں یہ بھی اطلاع درج تھی کہ ان کے پرانے نام تبدیل کر کے ابوحمزہ اور ابوصالح رکھ دیئے گئے ہیں۔ پھر ان کے خطوں کے ذریعہ ہی ان کی خیریت معلوم ہوتی رہی تھی۔ خطوں کی تحریر میں بتدریج پختگی آتی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ان کے جذبہ جہاد وشہادت میں بھی۔

دو برس قبل ان کا آخری اور تفصیلی خط آیا تھا جو انہیں آج بھی من وعن یاد تھا۔

قبلہ والد صاحب اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ ہم لوگ خیریت سے ہیں۔ ہماری دینی تعلیم کے ساتھ عسکری تربیت بھی لگ بھگ مکمل ہوگئی ہے۔ ہم لوگ تمام جدید اسلحوں کو استعمال کرنا سیکھ گئے ہیں۔ اب ہمیں خودکش بمبار بننے کی ٹریننگ دی جارہی ہے۔ اس کے بعد ہمیں مقبوضہ ریاست یا کافروں کے کسی اور محاذ پر بھیج دیا جائے گا۔ ہم لوگ بڑی بے صبری سے اس دن کا

انتظار کر رہے ہیں۔ محاذ سے لوٹنے والے مجاہدین ایسے واقعات سناتے ہیں کہ جذبۂ ایمانی جوش مارنے لگتا ہے۔ کافروں کی فوج مسلمانوں کے خون سے جبر وتشدد کی نئی تاریخ رقم کر رہی ہے۔ بے گناہ مردوں کو بے دریغ قتل اور پاکیزہ عورتوں کی عزت وناموس کو پامال کر رہی ہے۔ ہم لوگ جلد ہی اُن کافروں پر برق بن کر گریں گے۔

یہاں ہمیں قران وحدیث کی تعلیم دی گئی۔ دین کے ارکان درست طریقے سے ادا کرنے کے درس دیئے گئے۔ اللہ کے رسول اور صحابہ کرام کی حیات مبارکہ سے روشناس کرایا گیا۔ قران مجید کو مستند ترجمے کے ساتھ سمجھایا گیا۔ دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی حیات دوامی کی تفصیل بتائی گئی۔ ابو! جنت میں بھی درجات ہوں گے اور شہدائے کرام سب سے بلند درجے کے مکیں ہوں گے اور ان کی شفاعت سے ان کے ستر اقربا جنت میں داخل ہوں گے بشرطیکہ وہ شرک میں ملوث نہ ہوں۔ ہم دونوں آپ لوگوں کیلئے اس جہاں میں کچھ نہ کر سکے لیکن اللہ کے کرم سے اگر شہادت کا شرف حاصل ہو گیا تو آخرت میں شفاعت کے کام آئیں گے۔

ابو! آپ پابندی سے نماز پڑھتے ہیں نا۔ اسے کسی حال میں ترک مت کیجئے۔ گناہ عظیم ہے۔ شرعی وضع قطع اور لباس رکھئے۔ داڑھی بھرپور اور مونچھیں ترشی ہوئی ہوں۔ قمیض گھٹنے کے نیچے اور شلوار ٹخنے کے اوپر تک ہوں۔ کسی کو خدا حافظ نہ کہئے۔ کلمۂ شرک ہے۔ اللہ حافظ کہا کیجئے۔ ہر جمعرات کو مسجد کی مجالس میں جایا کیجئے۔ ایمان میں پختگی اور تازگی آتی ہے۔ گھر میں پردے کا خاص اہتمام کیجئے گا۔ امی کبھی کبھی بے احتیاطی برت جاتی ہیں، انہیں سختی سے سمجھایئے گا۔ نہیں سمجھنے پر مار بھی سکتے ہیں۔ منی دس سال کی ہو گئی ہوگی۔ اس کی تعلیم بند کرا دیجئے اور گھر سے باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دیجئے۔ گھر میں کسی نامحرم کو داخل ہونے کی اجازت مت دیجئے۔ اللہ کا ذکر کثرت سے کیا کیجئے اور شرک کے بال برابر سائے سے بھی خود کو محفوظ رکھئے۔ مسلمانوں کے درمیان بہت سے ایسے بدعقیدہ افراد ہیں جو اللہ کے ساتھ غیروں کو شریک کرتے ہیں۔ رسول کو عالم الغیب اور حاجت روا مانتے ہیں۔ ان کی نشانیوں کو مقدس جانتے ہیں اور ان کی تاریخ ولادت پر جشن مناتے ہیں جبکہ رسول بھی ہماری اور آپ کی طرح ایک بشر ہیں۔ ان گمراہوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کیجئے۔

انشاءاللہ کافروں سے نپٹ کر ہماری تنظیم ان کی طرف بھی توجہ دے گی۔ہم دونوں بھائی جلد ہی آپ سے ملیں گے یا پھر جنت میں ملاقات ہوگی۔انشاءاللہ۔آپکا ابوحمزہ وابوصالح

تقریباً دو مہینے بعد حرکت الناصرین کے کمانڈر ان چیف ان کے گھر تشریف لائے تھے۔ ان کے دونوں بیٹوں کی شہادت کا مژدہ سنایا تھا اور انہیں مبارک باد دی تھی۔انہوں نے ان کے ساتھی مجاہدوں کے حوالے سے بتایا تھا کہ وہ دونوں مقبوضہ ریاست میں ایک محاذ پر کافر فوجوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔دونوں نے نہایت بہادری سے لڑتے ہوئے بارہ پندرہ کافروں کو واصل جہنم کیا تھا۔لیکن انتہائی جوش میں دونوں کھلے میدان میں نکل آئے تھے کہ اچانک گولیوں کی باڑھ نے ان کے جسموں کو چھلنی کر دیا تھا۔دونوں زمین پر گر کر بے جان ہوگئے تھے تبھی انہوں نے ایک حیرت انگیز واقعہ رونما ہوتے ہوئے دیکھا۔آسمان بالکل صاف اور دھوپ نکھری ہوئی تھی۔یک لخت جانے کہاں سے نرم گھرے بادل آگئے اور فضا میں تیرگی چھا گئی۔کچھ ہی دیر میں تیرگی چھٹ گئی تو انہوں نے دیکھا کہ دونوں کے جسم ایسے خوشنما اور خوشبودار پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے جو کبھی کہیں دیکھے نہ گئے تھے۔غیب سے واضح اشارہ ملا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شہادتیں قبول فرمائیں اور ستر دونی ایک سو چالیس رشتہ داروں کو اپنی شفاعت کے ذریعہ جنت میں داخل کرانے کا حق بھی انہیں عطا ہوا۔کمانڈر ان چیف نے یقین کے ساتھ کہا کہ والد ہونے کی حیثیت سے لازمی طور پر پہلی شفاعت انہیں کی ہوگی۔انہوں نے انہیں جنت کی بشارت دی تو وہ جذبۂ تشکر نے مغلوب ہوکر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگئے۔تنظیم حرکت الناصرین کی جانب سے ان کیلئے ایک معقول رقم کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا تھا جو انہیں ہر ماہ باقاعدگی سے مل جاتا تھا۔کبھی کبھی تنظیم ان سے چھوٹی موٹی خدمات بھی لیتی تھی جنہیں وہ نہایت فخر وانبساط کے ساتھ انجام دیتے تھے۔

شہر جانے والی ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو وہ لپک کر ایک ڈبے میں سوار ہوگئے۔ کھڑکی کے قریب ہی دو سیٹیں خالی تھیں۔انہوں نے ایک پر قبضہ جما لیا۔ٹرین کھلنے والی تھی کہ ایک خاتون اندر داخل ہوئی اور ان کے سامنے والی دوسری سیٹ پر بیٹھ گئی۔ٹرین چل پڑی تو انہوں نے قدرے حیرت سے اس خاتون کے متعلق سوچا۔وہ چالیس بیالیس سالہ قبول صورت عورت تھی۔اس

ہانکا کرنے والے

کا اس طرح بے پردہ اور تنہا سفر کرنا تعجب خیز امر تھا۔ جب سے دینی بیداری آئی تھی عورتیں گھر کی چاردیواری سے کم ہی باہر نکلتی تھیں۔ کبھی کوئی شدید ضرورت پیش آ جاتی تو سخت پردے میں کسی محرم کے ساتھ ہی سفر کرتیں۔

''آپ مولوی احسان اللہ ہیں نا؟'' دفعتاً اس عورت نے انہیں بے تکلفی سے مخاطب کیا تو وہ چونک پڑے۔ تو وہ انہیں پہچانتی ہے۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے دوسرا سوال اچھال دیا۔

''شہر جا رہے ہیں؟'' انہوں نے ایک بار پھر مختصراً ہاں کہنے پر اکتفا کیا۔

''میں بھی شہر جا رہی ہوں۔ اپنی دونوں بیٹیوں سے ملنے.........''

''تمہاری بیٹیاں شہر میں کس جگہ بیاہی گئی ہیں''؟ انہوں نے یوں ہی سرسری لہجے میں پوچھ لیا۔

''وہ بیاہی نہیں گئی ہیں۔ وہ دونوں تو وہاں پیشہ کرتی ہیں۔'' جواب میں اس عورت نے جیسے زوردار دھماکہ کیا۔ ''اب وہ تو اس قصبے میں آ نہیں سکتیں اس لئے میں ہی ان سے مل آتی ہوں۔ ساتھ ہی اپنا اور اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں کا ماہانہ خرچ بھی لے آتی ہوں۔''

انہیں اس عورت کی بے باکی اور بے حیائی پر شدید حیرانی ہوئی۔ اس نے کتنی آسانی اور صاف گوئی سے اتنی غلیظ بات کہہ دی تھی۔ ان کی رگ تبلیغ پھڑک اٹھی۔ ''تم اس حرام کی کمائی سے اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کر رہی ہو۔''

''حرام حلال کیسا؟ پیٹ تو بھرنا ہی پڑتا ہے۔'' اس نے احساس سے عاری لہجے میں بے حد لاپرواہی سے کہا۔ ''آپ بھی تو وظیفہ خوار ہیں۔ سنا ہے کہ آپ کے دو بیٹے مقبوضہ ریاست میں کہیں مارے گئے ہیں۔ ان کی موت کے بدلے آپ کو کسی جہادی تنظیم کی طرف سے ماہانہ رقم ملتی ہے۔ میں اپنی بیٹیوں کا زندہ گوشت کھاتی ہوں اور آپ اپنے بیٹوں کا مردہ گوشت......''

''خاموش رہو۔'' وہ بری طرح تلملا اٹھے۔ ''تم میرے شہید بیٹوں کی تضحیک کر رہی ہو۔'' ان کے غصے کا اس عورت پر قطعی اثر نہیں ہوا۔ وہ اسی اطمینان سے بولی۔

''میں ان کی تضحیک نہیں کر رہی ہوں۔ میں بھی ایسے ہی ایک شہید کی بیوہ ہوں۔ مجھے

یقین ہے کہ آپ کے دونوں بیٹے بے چارے بے حد معصوم اور سیدھے سادے رہے ہوں گے۔ انہیں تو شکاریوں کا کوئی شاطر گروہ ہانکا کر کے شکارگاہ کی طرف لے گیا ہوگا۔ جیسا کہ کوئی دوسرا گروہ میری معصوم بیٹیوں کو منڈی تک لے گیا۔''

''تم نہایت ناقص العقل عورت ہو۔'' انہیں اس کے بے ہودہ خیالات پر تاسف ہوا۔ ''تمہارے دل میں اللہ اور اس کے دین کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ تم ان عظیم المرتبت مجاہدوں کو برا سمجھ رہی ہو جو اللہ اور دین کی راہ میں خود کو وقف کر چکے ہیں۔ جو مسلمانوں کی سرخروئی اور غلبے کیلئے مقدس جہاد میں مصروف ہیں۔ جو قوم کی بیٹیوں کی عزت و ناموس کے تحفظ کیلئے مقبوضہ ریاست میں کافروں سے ایک مشکل جنگ کر رہے ہیں۔''

''عزت و ناموس کا تحفظ ...... ہونہہ......'' اس عورت کے لہجے میں گہری حقارت تھی۔ ''ان کی ناک کے نیچے شہر میں قوم کی بیٹیوں کی عزت ٹکے ٹکے میں فروخت ہو رہی ہے۔ ان کے تحفظ کی تو فکر نہیں اور چلے ہیں سرحد پار عزت و ناموس کی حفاظت کرنے۔ یہ لوگ دین کو سرخرو نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنے بدبودار نوکیلے پنجوں سے اس کی شبیہ کو بری طرح مسخ کر رہے ہیں۔ معصوم بچوں کے دل و دماغ میں زہر بھر کر انہیں موت کے منہ میں ڈھکیل رہے ہیں۔ آسمان پر جو خدا ہے وہ زمین پر فساد و قتال کرنے والے ان ریاکار اور خونخوار درندوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔''

مولوی احسان اللہ اس عورت کی ہرزہ سرائی پر بری طرح مشتعل ہو رہے تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے خود پر ضبط رکھا اور اس کو قائل کرنے کی آخری کوشش کی۔ ''ہمارے رسول اکرم نے ....''

''رسول کا نام تو اپنی زبان پر لایئے بھی نہیں''۔ اس عورت نے بے حد برافروختگی سے قطع کلامی کی۔ ''ہمارے رسول تو رحمت العالمین تھے۔ انتہائی غلط اور مذموم عمل کے دفاع میں بھی سینکڑوں جواز پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ ان میں سب سے سہل اور موثر جواز اس غلط عمل کو مذہب اور اس کی مقدس شخصیت سے منسوب کر دینا ہے۔ اس کے بعد تو اس کی مخالفت کرنے والا قابل گردن زدنی ہی قرار پاتا ہے۔ پیارے رسول نے کتنے قتل کئے؟ یہ درندے ہرگز اس رسول کے مقلد نہیں

ہو سکتے جو داعی امن و آشتی تھے۔ یہ لوگ تو پتہ نہیں کس شیطان کے پیروکار ہیں جو محض بدنام کرنے کیلئے رسول کے مقدس نام کو اپنے ہر شیطانی فعل میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اقتدار و اختیار کے بھوکے ان درندوں کے منہ کو انسانی گوشت کی لت لگ گئی ہے۔ ہم جیسوں کے پیٹ تو دو چار روٹیوں سے ہی بھر جاتے ہیں لیکن یہ لوگ دو چار ہزار انسانوں کا گوشت کھا کر بھی شکم سیر نہیں ہوتے''۔

ٹرین شہر کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی تو مولوی احسان اللہ نے اطمینان اور راحت کی سانس لی۔ وہ بھی کہاں آن پھنسے تھے۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکے اور ٹرین کے مکمل رکنے سے قبل ہی پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ اس فاحشہ اور بے دین عورت نے ان کی طبیعت بری طرح مکدر کر دی تھی۔ اس کی قبیح باتوں سے منہ میں جیسے تلخی گھل گئی تھی۔ وہ اسٹیشن کے باہر نکلے اور ایک پان کی دکان پر رک گئے۔ انہوں نے ایک میٹھے پان کا بیڑا خریدا اور منہ میں ڈال لیا۔ وہ بیڑا چباتے ہوئے آگے بڑھے یکا یک جانے کیوں انہیں اپنی زبان پر مردہ گوشت کا ذائقہ محسوس ہوا اور انہیں زوروں کی ابکائی آ گئی۔ وہ ہڑبڑا کر راستے کی ایک نالی پر بیٹھ گئے اور قے کرنے لگے۔

انہوں نے شدید حیرت اور خوف سے دیکھا کہ ان کے منہ سے خون میں سنے ہوئے گوشت کے ٹکڑے نکل رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

خواب واقعہ

محرم الحرام کی دسویں تاریخ تھی۔امام عالی مقام حضرت حسین ابن علیؓ کے ذکر کی مجلس بجی تھی۔کشادہ ہال میں جگہ بہ جگہ مومی شمعیں روشن تھیں۔ بڑے دروازے کے سامنے کا آخری حصہ سطح زمین سے قدرے بلند تھا جس کے درمیان ایک تخت نما کرسی رکھی تھی۔ کرسی کے دونوں طرف لکڑی کی منقش میز پر موٹی قندیلیں روشن تھیں اور قریب ہی اگر دان میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔کرسی پر ایک سرخ وسپید اور باریش بزرگ جلوہ افروز تھے۔ان کے جسم پر سفید لباس اور سر پر سبز عمامہ بندھا تھا۔ان کے چہرے سے نور سا پھوٹ رہا تھا۔تمام ہال جوان اور بوڑھے افراد سے بھرا ہوا تھا پھر بھی اتنی گہری خاموشی طاری تھی کہ سانسوں کے زیر و بم بھی واضح طور پر محسوس کئے جاسکتے تھے۔ بڑا ہی خواب ناک ماحول تھا۔سب کی نگاہیں کرسی پر موجود باوقار شخصیت پر مرکوز تھیں۔اچانک اس بزرگ کے لب مرتعش ہوئے اور فضا میں ان کی نرم لیکن پر اثر آواز گونجی۔

''شہر کوفہ میں جشن کا سماں تھا۔خاکروب راستوں کے گرد وغبار صاف کر رہے تھے۔ سقے پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے۔گھروں سے دف بجنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں اور خوش الحان خواتین کی زبان پر وہ عربی نغمے تھے جو کسی خاص الخاص مہمان یا فاتح حکمران کی آمد پر گائے جاتے تھے۔زرق برق پوشاکوں میں ملبوس بچے وجہ جشن سے نا آشنا بے حد شادمانی اور کچھ حیرانی سے خلاف معمول ہونے والے تمام عمل کے تماشائی تھے۔ ہر شخص کی مضطرب اور پر اشتیاق نگاہیں شہر کی خاص شاہراہ پر جمی تھیں ۔ فضا میں محبوب خدا بنائے ارض وسما رسول اللہ کے نور نظر، خاتون جنت پیکر صبر و استقامت حضرت فاطمہؓ کے لخت جگر، سردار نوجوانانِ جنت عکس نبیؐ امام عالی مقام حسین ابن علیؓ کی آمد کا مژدہ گردش میں تھا۔اس پر مستزاد کہ ان کے ساتھ پیغمبر ذی شان، جن پر ہر نفس کی جان قربان، کے خاندان کی معزز اور مقدس خواتین اور دیگر قرابت داروں کی آمد کا بھی شہرہ تھا۔

یزید بن معاویہ نے ان کے شایان شان استقبال کیلئے کوفے میں گورنر عبداللہ بن زیاد کو تعینات کر رکھا تھا۔ ابن زیاد نے ان کے شہر سے قریب آنے کی اطلاع پاکر حر بن زید کو ایک ہزار لشکر کے ساتھ ان کی رہنمائی کے لیے آگے ہی روانہ کر دیا تھا۔ حر بن زید شہر کے باہر اس مقدس قافلے سے ملا اور انہیں اپنی جلو میں لئے ہوئے شہر کی طرف بڑھا۔ قافلہ دریائے فرات کے قریب پہنچا تو امام عالی مقام نے وہاں کچھ دیر قیام کی منشا ظاہر کی۔ احترامِ خواہش میں حر بن زید نے اپنے لشکر کو کچھ ہی فاصلے پر موجود میدان کربلا میں خیمے نصب کرنے کا حکم دیا اور تمام اہل بیت کو دریائے فرات کے کنارے لاکر ان سے درخواست کی کہ وہ تمام لوگ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر تر و تازہ ہولیں۔ ان لوگوں نے دریائے فرات کے ٹھنڈے اور شیریں پانی سے تشنگی بجھائی اور خوب سیراب ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے دیر تک غسل کیا اور بے حد فرحاں اور شاداں خیموں میں چلے آئے۔

قافلے کو شہر میں داخل ہونے میں تاخیر ہونے لگی تو ابن زیاد کو تشویش ہوئی۔ اس نے عمرو بن سعد کو چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ ان کی خیریت دریافت کرنے اور انہیں بحفاظت لانے کے لئے روانہ کیا۔ آخرش باشندگان شہر کا لمحۂ انتظار ختم ہوا۔ ان کے مضطرب قلب ونظر کو یک گونہ قرار حاصل ہوا کہ اس خاص شاہراہ پر لشکر یزید کے سایۂ عقیدت میں وہ مقدس قافلہ نمودار ہوا۔ عبیداللہ بن زیاد اپنی فوج کے ساتھ اس قافلے کے استقبال کے لئے آگے بڑھا جو بہتر افراد و خواتین پر مشتمل تھا۔ سب سے آگے ایک دراز قد خوبصورت ناقے پر امام عالی مقام سوار تھے۔ ابن زیاد نے ناقے کی باگ تھامی اور احتراماً سر کو خم کرتا ہوا امام عالی مقام سے مخاطب ہوا۔

''میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ میں یزید بن معاویہ کا نمائندہ خاص اور غلام رسول اللہ، عبیداللہ بن زیاد آپ کا اور آپ کے عزیز و اقارب کا استقبال کرتا ہوں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ لوگوں کو نہایت ادب و احترام کے ساتھ دربار یزید میں پہنچادوں۔ آپ اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے وہاں تشریف لے چلیں گے یا شہر کوفہ میں کچھ یوم قیام کرنا پسند فرمائیں گے''۔

امام عالی مقام کے چہرہ اقدس پر شگفتگی کی کرنیں نمودار ہوئیں۔ انہوں نے زیر لب تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ''اے زید کے لائق فرزند۔ ہمیں تو دریائے فرات کے حیات افروز پانی نے بالکل

سیراب کر دیا۔ ہم لوگ پوری طرح تازہ دم اور چاق و چوبند ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہمیں بلا تاخیر یزید بن معاویہ کے دربار میں پہنچا دو''۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں ابھی لشکر کو کوچ کا حکم دے کر آتا ہوں''۔

ابن زیاد واپس لوٹ گیا تو انہوں نے اپنے قافلے کی طرف نگاہ کی۔ ان کے ٹھیک عقب میں عباس بن علیؑ ناقے پر سوار تھے اور ان کے ارد گرد ہی دیگر عزیز و اقارب موجود تھے۔ سبھی بے حد ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ کسی کے چہرے پر تکان کا شائبہ تک نہ تھا۔ انہوں نے ان محملوں کی طرف دیکھا جن پر حضرت زینب بنت علیؑ اور دوسری معزز خواتین سوار تھیں۔ سب نے ان کے فرمان کی خاموش زبان میں تائید کی۔ چند ہی ثانئے کے بعد ابن زیاد کا اشارہ پا کر قافلہ آگے روانہ ہوا۔ شاہراہ کے دونوں اطراف عقیدت مندوں کا جم غفیر تھا جو ان کے چہرۂ مبارک کے دیدار کا مشتاق تھا۔ قافلے پر گلوں کی بارش ہو رہی تھی۔ دف کی آوازیں تیز تر ہوتی جا رہی تھیں لیکن استقبالیہ نغمے گاتی ہوئی عورتیں فرط جذبات سے مغلوب ہو کر گنگ سی ہو گئی تھیں۔ قدرے توقف کے بعد ان کی قوت گویائی واپس آئی تو ان کی زبان پر فقط ایک ہی التجا لرزاں تھی۔

یا امام عالی جاہ ایک نگاہ یا بی بی فاطمہؓ کے لخت جگر ایک نظر......

قافلہ خراماں خراماں آگے کی جانب رواں تھا۔ امام عالی مقام بے تاب مجمع پر محبت پاش نگاہیں ڈالتے ہوئے بلند آواز میں ان کے لئے دعا گو تھے۔ جس فرد پر ان کی نظر دم بھر کے لئے ٹھہر جاتی تو وہ انبساط سے یوں رقصاں ہو جاتا جیسے اسے ہفت اقلیم کے خزینے حاصل ہو گئے ہوں۔ تمام راہ ایسا ہی منظر پیش نگاہ تھا۔ یوم عاشورہ تو جیسے ان کیلئے یوم نجات بن گیا تھا۔ انہیں کامل یقین تھا کہ ان کی ایک نگاہ التفات باعث نجات ہے۔ انہیں اللہ کے محبوب رسولؐ کا مشہور قول 'حسین مجھ سے اور میں حسین سے ہوں' اچھی طرح ذہن نشیں تھا۔ تو گویا ان کا دیدار بالواسطہ رسول اکرمؐ کا دیدار تھا اور اس شرف سے کوئی بھی اہل ایمان اور عاشق رسول محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ شاید ہی کوئی حرماں نصیب ہو جس نے اس دن امام عالی مقام کے چہرۂ پرنور کی دید سے اپنی آنکھوں کو جلا نہ بخشی ہو''۔

کرسی پر تشریف فرما بزرگ کا کلام جاری تھا۔ ہال میں موجود سامعین کی آنکھوں میں

استعجاب کی پرچھائیاں رقص کرنے لگی تھیں اور وہ لوگ ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اپنی جگہ پر پہلو بدلنے لگے تھے لیکن کسی میں بزرگ کے کلام میں رخنہ ڈالنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ بزرگ گویا تھے۔

آخر کار امام عالی مقام کا قافلہ یزید بن معاویہ کے محل کے قریب آ پہنچا۔ اطلاع پاتے ہی یزید بن معاویہ خود امام عالی مقام کی پیشوائی کے لئے باہر نکل آیا۔ اس نے امام عالی مقام پر سلام بھیجا اور اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ خواتین مطہرات اہل بیت کو عزت واحترام کے ساتھ زنان خانے میں پہنچا دیا جائے۔ وہ خود امام عالی مقام اور ان کے ساتھیوں کو لے کر دربار میں داخل ہوا۔ وہاں موجود تمام عمائدین سلطنت نے اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر انہیں تعظیم دی۔ یزید بن معاویہ امام عالی مقام کے ساتھ مسند خلافت کے قریب پہنچا اور ان سے مسند نشین ہونے کی گزارش کی۔ امام عالی مقام نے قدرے پس و پیش کیا تو یزید بن معاویہ نے اراکین دربار سے استفسار کیا۔

''تم لوگ منصب خلافت کے لئے میرے اور حسین ابن علیؓ کے مابین کس کو بہتر انتخاب مانتے ہو''؟

تمام اراکین دربار نے یک زبان ہو کر امام حسین ابن علیؓ کا نام لیا۔ دربار کا سب سے معمر رکن اپنی نشست پر کھڑے ہو کر یزید سے مخاطب ہوا۔

''اے یزید بن معاویہ، تیرے اور حسین ابن علیؓ کے درمیان کیا موازنہ۔ تقویٰ گزاری ہو یا قرابت داری، وہ ہر لحاظ سے ہم سب پر فوقیت رکھتے ہیں اور یہ ممکن ہی نہیں کہ ان کی موجودگی میں کوئی دوسرا فرد اس منصب جلیلہ پر فائز ہونے کا حقدار ہو''۔

''اے بزرگ!'' یزید بن معاویہ مودبانہ انداز میں گویا ہوا۔ ''تیری اور تمام اراکین دربار کی حق گوئی اور بے لاگ اظہار خیال سے اللہ اور اس کے رسول راضی ہوں۔ دین حق کے لیے یہ خوش آئند امر ہے کہ تم جیسے حق پرست اور بے خوف لوگ موجود ہیں جنہیں اللہ کی خوشنودی ہی سب سے عزیز ہے اور جو بغیر کسی مصلحت و منافقت کے کسی بھی غیر اسلامی اور غلط کاز کی مخالفت کر سکتے ہیں''۔ پھر وہ امام عالی مقام کی طرف متوجہ ہوا۔

''میرے ماں باپ آپ کے نانا جان پر قربان۔ آپ نے لوگوں کی راست گفتاری کا بے باک مظاہرہ دیکھا۔ میری کیا مجال کہ میں حق اور خلق سے روگردانی کر کے خلافت کی ذمہ داری قبول کروں۔ آپ اتفاق رائے سے اس کے مستحق اور اہل ہیں۔ اس لئے التجا ہے کہ آپ مسند خلافت کو رونق بخشیں''۔

امام عالی مقام اس کے مسلسل اصرار پر مسند خلافت پر رونق افروز ہوئے تو ہر سمت سے نعرۂ تکبیر بلند ہوا۔

ہال میں موجود تمام سامعین کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ آخر حاکم شہر سے رہا نہیں گیا اور وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ بزرگ نے خاموش ہو کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''آپ کا بیان خلاف واقعہ ہے۔ ایسا تو نہیں ہوا۔ بلکہ یزید بن معاویہ نے تو......''

بزرگ نے اس کا کلام مکمل ہونے سے پہلے ہی استفسار کیا۔

''اگر تم یزید بن معاویہ کی جگہ ہوتے اور نواسہ رسولؐ امام عالی مقام موجود ہوتے تو تمہارا عمل کیا ہوتا''؟

''میں''!...... حاکم شہر اس غیر متوقع سوال پر تذبذب میں مبتلا ہوا لیکن قدرے توقف کے بعد مستحکم لہجے میں بولا۔ ''میں یقیناً امام عالی مقام کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو جاتا۔ ان کی جیسی محترم شخصیت کی موجودگی میں میری خلافت کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا''۔

''تو کیا یزید بن معاویہ تم سے بھی کمتر تھا''۔ بزرگ نے اسی نرم لہجے میں کہا۔ ''گمرہی اور بدگمانی سے بچو۔ فراموش نہ کرو کہ یزید صحابی رسولؐ کا فرزند تھا اور اس کے عمائدین خلافت میں بہت سارے افراد بھی صحابہ کرام کی اولادوں میں سے تھے۔ انہوں نے اپنے باپوں سے سن رکھا تھا کہ رسول اکرمؐ اپنے نواسوں کے تئیں کتنی شفقت اور محبت کا جذبہ رکھتے تھے اور حسینؓ کے روئے مبارک میں تو ان کی جھلک تھی۔ حضورؐ کا وصال ماضی قریب کا واقعہ تھا۔ ابھی لوگوں کا ایمان پختہ اور تازہ تھا اور محبت رسولؐ تو جزوئے ایمان تھا۔ دلوں میں نسبت رسولؐ کے باعث اہل بیت سے گہری عقیدت موجود تھی۔ اسلام اپنی تمام تر اعلیٰ صفات اور روشن احکامات کے ساتھ زندہ تھا۔ تو پھر کس طرح ممکن

تھا کہ نواسئہ رسولؐ کے ساتھ وہ سلوک روانہ رکھا جاتا جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ راضی ہوتے۔

یزید بن معاویہ نے امام عالی مقام کو خلافت سونپ کر حق پرستی اور عدل پسندی کی وہ روشن مثال قائم کی کہ آئندہ کے لئے ہر اس ممکنہ فتنے کا سد باب ہو گیا جو حصول خلافت کے سلسلے میں وقوع پذیر ہوسکتا تھا۔ اول تو اپنی اولاد کو ولی عہد نامزد کرنے کی غیر شرعی اور غیر اسلامی روش ابتدا میں ہی کالعدم ہو گئی اور دوئم اتفاق رائے سے خلیفہ منتخب کرنے کے عین اسلامی اور غیر متنازع طریقے پر حتمی مہر لگ گئی۔ امام عالی مقام کے کامیاب اور مثالی دور خلافت کے بعد کتنے ہی خلفاء ہوئے۔ ان کے انتخاب میں یزید بن معاویہ کا صالح عمل مشعل راہ بنا رہا اور عوام وخواص کی اکثریت قوم کے سب سے معتبر اور برگزیدہ فرد کو خلیفہ نامزد کرتی رہی اور اس غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخاب پر کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ خلفائے وقت نے بھی اس منصب کو عیش ونشاط کا ذریعہ نہیں بلکہ خدمت خلق اور انصاف کے راستے خدا اور رسول کی خوشنودی حاصل کرنے کا موقع غنیمت جانا۔ انہوں نے اپنی بہترین خدمات دیں اور عوام میں مقبول اور بارگاہ حق میں سرخ رو ہوئے۔ یہ یزید بن معاویہ کی اتباع کا ہی خوشگوار نتیجہ تھا کہ دیگر اقوام کی طرح عالم اسلام میں کبھی اقتدار کی جنگ نہیں ہوئی اور خلافت کی منتقلی بغیر کشت و خون کے پر امن طریقے سے ہوتی رہی۔ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی وہی روش قائم ہے۔

رفتہ رفتہ اسلام اپنی حقانیت اور مساوات کے باعث اپنا دائرہ وسیع کرتا رہا اور اسے ایک مرکز کے تحت برقرار رکھنا ممکن نہ رہا لہٰذا بہت ساری آزاد خود مختار مملکتیں قائم ہو گئیں۔ ان میں بھی حکمرانوں کے انتخاب میں وہی اسلامی صالح راہ اپنائی جاتی رہی جسے یزید بن معاویہ نے آئندہ نسلوں کے لئے اپنے طرز عمل سے ہموار کی تھی۔ خطۂ عرب کو خانۂ خدا اور روضۂ رسولؐ کے تقدس کے باعث ہر دور میں مرکزیت حاصل رہی۔ عالم اسلام اپنی رہنمائی کے لئے اسی کی سمت نگاہ کرتا۔ اپنے اس خاص درجے کے باعث خطۂ عرب کچھ زیادہ ہی محتاط اور ذمہ دار تھا۔ یزید بن معاویہ کے اعمال حسنہ کی پیروی جتنی سختی اور مستعدی سے یہاں کی جاتی ہے وہ دیگر مملکت اسلامیہ کے لئے قابل تقلید ورشک ہے۔ رسول اللہ کی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کو ان سے فطری طور پر کچھ زیادہ ہی محبت وعقیدت تھی جس کا مظاہرہ انہوں نے اس پاک خطے کو ان کے نام سے منسوب

کر کے کیا اور اس طرح یہ خطہ 'محمدی عربیہ' کے نام سے تمام عالم میں متعارف ہوا۔ یزید بن معاویہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہاں کبھی موروثی حکومت کا تصور تک پیدا نہیں ہوا بلکہ خالص اسلامی طریقے سے عوام یہاں کے حکمرانوں کا انتخاب کرتی رہی ہے اور وہ نہایت ایمانداری سے خدمت خلق اور عالم اسلام کی رہ نمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ محبوب خدا رسول اکرم کے قدم مبارک کی برکت سے اس کی اور اطراف کی صحرائی بنجر زمینیں سیال سونا اگلنے لگیں تب بھی خوف خدا اور حب رسولؐ میں مستغرق حکمرانوں کی صفات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انہوں نے اسے پیغمبر کا ترکہ سمجھا جس پر تمام امت کا مساوی حق ہوتا ہے۔ اور انہوں نے ان کے حقوق ادا کرنے میں کبھی غفلت اور کوتاہی نہیں برتی۔ خود تو چٹائی پر بیٹھے خالی شکم سلطنت کے انتظامی امور کو انجام دیتے ہیں لیکن عالم اسلام کا شاید ہی کوئی فرد ہو جو اس پیغمری ترکے سے مستفیض نہ ہوتا ہو۔ مرکز اسلام میں دین کی راہ مستقیم پر یہ منتخب حکمراں جس ثابت قدمی سے گامزن ہیں وہ تمام مملکت اسلامیہ کے لئے نمونہ عمل اور باعثِ فلاح ہیں۔ آج انہیں صالح اور حق پرست اسلامی حکمرانوں کے سبب اسلام بنیادی اور روحانی اقدار کے ساتھ زندہ اور تمام عالم میں تابندہ ہے۔ ہر مملکت اسلامیہ میں مکمل امن و امان، عدل و انصاف اور خوش حالی کا دار دورہ ہے۔ ہر مملکت کو داخلی استحکام اور اتحاد حاصل ہے۔ عوام مطمئن ہیں تو غنیم نابود اور سازشی مفقود ہیں۔ ہر خطے میں مسلمان آپسی اخوت واتحاد کے ساتھ بالکل آزاد اور بے خوف و خطر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

بغور جائزہ لیا جائے تو موجودہ پرامن اور خوشگوار حالات یزید بن معاویہؓ کے انہیں اسلامی شعار اور جذبۂ ایثار کے پیدا کردہ ہیں جن سے صدیوں پہلے مسلمان روشناس ہوئے تھے۔

اللہ تعالیٰ اتباع یزید کرتے ہوئے مکمل اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ان حکمرانوں کو اسی طرح راہ مستقیم پر قائم رکھے اور تمام مسلمانوں کو اسی طرح اخوت واتحاد اور امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہنے کی ہدایت دے''۔

بزرگ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی تو تمام حاضرین مجلس نے جیسے خواب زدگی کے عالم میں آمین' کہا اور پھر ہال سے اس طرح نکلنے لگے جیسے خواب میں چل رہے ہوں۔ ☆☆☆☆☆☆

ادنیٰ فرد کا عذاب

جنار دھن پرشاد تھانے سے نکلا تو رات نصف سے زائد گزر چکی تھی۔ سڑک پر تیرگی کی دبیز چادر بچھی تھی۔ گہرے سناٹے کے وجود کو کتوں کے بھونکنے کی آوازیں مجروح کر رہی تھیں۔ رات گئے سڑکوں پر کتوں کی ہی حکمرانی ہو جاتی تھی۔ جب سے عدالت عظمیٰ کتوں پر مہربان ہوئی تھی اور ان کی نسل کشی پر مکمل پابندی عائد کی گئی تھی، ان کی تعداد میں بے تحاشہ اضافہ ہوتا گیا تھا۔ اسے اکثر اس صلۂ رحمی پر حیرانی ہوتی تھی کہ کتوں کے تئیں سنجیدہ اور فعال نظر آنے والی سرکار انسانوں کے معاملے میں اتنی لاپروا کیوں تھی۔ کیا روز بہ روز جارح ہوتے جارہے ان آوارہ کتوں کی گزند سے انسانوں کو محفوظ رکھنا اس کی ذمہ داری نہیں تھی۔

وہ مضمحل اور تھکے ہوئے قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔ اس کے بھاری بوٹوں کی آواز سے کتے چونکے اور بھونکتے ہوئے اس کی جانب لپکے۔ اس نے آج انہیں گالیاں بکتے ہوئے دور نہیں بھگایا۔ خاموشی سے چلتا رہا۔ کتوں نے کچھ دور تک تعاقب کیا اور پھر واپس پلٹ گئے۔ سڑک کے آگے موڑ پر ونود کمار کی پان دکان اب تک کھلی ہوئی تھی۔ اس نے دور ہی سے اسے آتے دیکھ لیا اور تیزی سے پان لگانے لگا۔ اس کی دکان پر کچھ پل رکنا جنار دھن پرشاد کے معمول میں شامل تھا۔ ونود کمار روزانہ اسے پان کی دو گلوریاں پیش کرتا اور پھر آہستگی سے پچاس کا ایک نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ کبھی کبھی وہ یوں ہی سرسری طور پر دریافت کر بیٹھتا۔ ''دھندا کیسا چل رہا ہے''؟

ونود کمار کے ہونٹوں پر عاجزانہ مسکراہٹ رینگ جاتی اور وہ ہمیشہ کی طرح ایک ہی جواب دیتا۔ ''آپ کی مہربانی ہے سرکار''۔

وہ پان کی گمٹی کے عقب میں دیسی شراب کا ناجائز کاروبار کرتا تھا۔ اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی مگر ان جیسے وردی پوشوں کے لیے بھی خاطر خواہ حصہ نکال کر رکھنا پڑتا تھا۔ جنار دھن پرشاد

اس کی دکان پر رکے بغیر بے خیالی میں گزر گیا تو وہ قدرے متعجب ہوا۔ اس نے آواز دے کر اسے روکنے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ ان پولیس والوں کا کیا بھروسہ؟ کہیں الٹی بلا ہی گلے نہ پڑ جائے۔

کچھ ہی فاصلے پر سڑک کے بائیں طرف لیمپ پوسٹ کے نیچے رکمنی کھڑی تھی۔ شاید اسے اب تک کوئی کم بخت گاہک نہیں ملا تھا ورنہ اس وقت تو وہ اپنی جھونپڑی میں اس کے ساتھ بند ہوتی۔ اس کی نگاہ جنارد ھن پرشاد کے بڑھتے ہوئے دھندلے سائے پر پڑی تو اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ اب اس کتے کو اپنی گرہ سے ہی بیس روپے دینے ہوں گے۔ اس نے گہری بے زاری اور فکر مندی سے سوچا۔ لیکن جنارد ھن پرشاد نے اس کی طرف مطلق دھیان نہیں دیا اور اپنی رو میں اس کے قریب سے ہوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹکا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے دھیرے سے دستک دی۔ دوسری بار کچھ تیز دستک دینے پر دروازہ وا ہوا اور اسکی بیوی آنکھیں ملتی ہوئی نمودار ہوئی۔ وہ ناگوار لہجے میں بڑبڑائی۔ ''آج پھر بہت دیر کر دی''۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک پر اس کے دونوں بچے محوِ خواب تھے۔ دوسری چارپائی کا بستر شکن آلود تھا۔ شاید اس کی بیوی بھی سوئی پڑی تھی۔ اس نے چارپائی پر بیٹھ کر جوتے موزے اتارے اور بستر پر دراز ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟ طبیعت خراب ہے؟'' اس کی بیوی نے اس کے پژمردہ چہرے کو تکتے ہوئے قدرے فکر مندی سے کہا تو اس نے نفی میں سر کو جنبش دی۔

''تو پھر۔ کیا کوئی پریشانی ہے''؟

اس نے گہری نگاہوں سے اپنی بیوی کے متفکر چہرے کو دیکھا۔ ناگہاں اس کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اپنی بیوی کو اپنی بے چینی، اپنے اضطراب سے پوری طرح آگاہ کر دے لیکن پھر اس نے ارادہ تبدیل کر دیا۔ پتہ نہیں وہ اس واقعے کو جس نے اس کا سکون و قرار چھین لیا تھا، کس تناظر میں لیتی اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دھیرے سے صرف اتنا کہا۔ ''مجھے نیند آ رہی ہے''۔

اس کی بیوی گہرے تذبذب میں اسے تکتی ہوئی خود بھی بستر پر آ گئی۔ کچھ ہی دیر میں اس کی بیوی کے خراٹے ابھرنے لگے۔ لیکن وہ آنکھیں پھاڑے پلسترا جڑے برہنہ چھت کو گھورتا رہا۔ گزشتہ واقعات کی تمام تصویریں ایک تسلسل کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگیں۔

کچھ روز قبل ہی شہر میں دہشت گردی کا واقعہ رونما ہوا تھا جس میں آٹھ افراد جاں بحق ہو گئے تھے اور درجن بھر کے قریب زخمی۔ حسب سابق محکمۂ پولیس یک لخت مستعد ہو گیا تھا لیکن اب تک کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا تھا۔ ہر چند کہ واقعہ شہر کی ایک مسجد میں پیش آیا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح اس کی پشت پر بھی کسی اسلامی دہشت گرد جماعت کی موجودگی کا یقین کر لیا گیا تھا۔ اسی یقین کے سائے میں تفتیش جاری تھی۔ اب تک کسی کی گرفتاری عمل میں نہیں آسکی تھی اور ہائی کمان کا دباؤ تھا کہ محکمے پر بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

کل کی رات کسی مصدقہ اطلاع پر ایس۔ پی۔ صاحب کی قیادت میں ایک مسلح دستہ نا معلوم منزل کی سمت روانہ ہوا تھا۔ وہ بھی اس خصوصی دستے میں شامل تھا۔ شہر کے مسلم اکثریت والے علاقے میں وہ لوگ داخل ہوئے تھے۔ منتخب مقامات پر چھاپے مارے گئے تھے لیکن کہیں سے کوئی قابل ذکر ثبوت ہاتھ نہیں لگا تھا اور نہ ہی کسی مشتبہ شخص کی گرفتاری کا جواز پیدا ہو سکا تھا۔ گھنٹوں کی مشقت کے باوجود انہیں بے نیل مرام ہی لوٹنا پڑا تھا۔ ایس۔ پی صاحب کے چہرے پر گہرا تناؤ تھا۔ انہیں اپنے جونیرس کے سامنے خاصی خفت اٹھانی پڑی تھی اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی برانگیختہ تھے۔ سارا عملہ ان کے ذہنی اشتعال سے سہا ہوا تھا۔ وہ علاقہ ختم ہی ہونے والا تھا کہ ایس۔ پی صاحب کے اضطراری حکم پر گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں انہوں نے دیکھا کہ سامنے دیوار کے پاس سراسیمگی کے عالم میں ایک نوعمر لڑکا کھڑا تھا۔ ایس۔ پی صاحب گاڑی سے کودے اور اس کی طرف لپکے۔ دوسروں نے بھی ان کی تقلید کی۔

"کون ہے؟ یہاں کیا کر رہا ہے"؟ ایس۔ پی صاحب کی کرخت آواز سے سترہ اٹھارہ سالہ لڑکے پر کپکی طاری ہو گئی۔ اس نے کانپتے ہوئے بمشکل کہا۔

"میں اسلم ہوں۔ یہیں بغل میں رہتا ہوں۔ بس پیشاب کرنے کے لیے باہر آ گیا تھا"۔

''سالے مسلّے ! جھوٹ بکتا ہے''۔ ایس۔ پی صاحب نے اس کے گال پر بھر پور طمانچہ رسید کر دیا۔ وہ دبلا پتلا نازک سے خدوخال والا لڑکا تھا۔ ایس۔ پی صاحب کے بھاری ہاتھ کی ضرب برداشت نہ کر سکا اور زمین پر گر گیا۔ انہوں نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا۔ ''اسے گاڑی میں ڈال دو''۔

اسے زمین سے اٹھا کر گاڑی میں ٹھونس دیا گیا۔ گاڑی سیدھے تھانے آ کر رکی۔ اس بدحواس اور خوفزدہ لڑکے کو اتار کر لاک۔ اپ میں بند کر دیا گیا۔

''سالے سبھی سازش میں شریک ہیں۔ آتنک وادیوں کو پناہ دیتے ہیں، ان کی مدد کرتے ہیں۔ اس پر تھرڈ ڈگری آزماؤ۔ سارا سچ اگل دے گا''۔

ایس۔ پی صاحب فرمان جاری کر کے چلے گئے تو تھانے کی کمان او۔ سی صاحب کے ہاتھ میں آ گئی۔ وہ فاتحانہ انداز میں لاک۔ اپ میں داخل ہوئے اور کچھ ہی ثانئے کے بعد لڑکے کی دلدوز چیخیں ابھرنے لگیں۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ لڑکا دہشت گردی کے ہر خفیہ تار سے واقف ہے، اس پر تشدد ہوتا رہا۔ اس سے سچائی اگلوانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی لیکن لڑکا بھی سخت جان ہی نکلا۔ تمام حربے استعمال کرنے کے باوجود اس کی زبان سے ان کی منشا کے مطابق بیان نہیں نکلا۔ آخر کار او۔ سی صاحب تھک کر باہر آ گئے اور اسے سپاہیوں کے سپرد کر کے آرام کرنے چلے گئے۔ ایس۔ پی صاحب کی ہدایت پر اس کی حراست کی رپورٹ رجسٹر میں درج نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے دوسرے دن اسے عدالت میں پیش کرنا چنداں ضروری نہ تھا۔

''دوسری رات جنار دھن پرشاد ڈیوٹی پر حاضر ہوا تو وہ لڑکا لاک اپ میں ہی موجود تھا۔ اس کی حالت ابتر تھی۔ اس کا تمام جسم زخموں سے چور تھا اور آنکھوں میں بے پایاں دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے جنار دھن پرشاد کو ایسی رحم طلب اور زخم خوردہ نگاہوں سے دیکھا کہ وہ ساری جان سے لرز گیا۔ اسے اس لڑکے کے بے قصور ہونے کا پختہ یقین تھا۔ اس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ناکام خالی ہاتھ لوٹ رہے بے حد خفت زدہ افسر کے ہتھے چڑھ گیا تھا لیکن اس معاملے میں وہ کیا کر سکتا تھا؟ وہ تو محض ایک کانسٹیبل تھا۔ اپنے افسران کے کسی فعل میں دخل دینے کا نہ وہ اختیار رکھتا تھا اور نہ ہی ارادہ۔ ویسے بھی اسے ان مسلّوں سے کوئی خاص ہمدردی نہیں تھی۔

آدھی رات کے قریب او۔سی صاحب کے ساتھ ایک بار پھر ایس۔پی صاحب تھانے میں داخل ہوئے۔اس نے کھڑے ہوکر انہیں تعظیم دی۔اوسی صاحب اسے پانی لانے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی کرسی کی طرف بڑھ گئے۔وہ پانی لیکر ان کے قریب پہنچا تو ایس۔پی صاحب کی فکرمندسی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''اوپر سے دباؤ بہت بڑھ گیا ہے۔جلد ہی کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں دکھائی گئی تو......''

او۔سی صاحب نے اثبات میں سر کو جنبش دیتے ہوئے ان کے ادھورے جملے کی تائید کی۔ وہ میز پر پانی رکھ کر اپنی جگہ واپس آ گیا۔وہ دونوں دیر تک آپس میں صلاح ومشورہ کرتے رہے اور پھر جیسے کسی اہم فیصلے پر متفق ہوکر یکا یک دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔اور پھر اسے حکم دیا۔

''کل والے لڑکے کو لے کر گاڑی میں بیٹھو''۔

اس نے حکم کی تعمیل کی۔بری طرح زخمی لڑکے کو کسی طرح لاک اپ سے نکالا اور اسے لیے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔او۔سی صاحب نے خود ہی اسٹیرنگ سنبھالی۔ایس۔پی صاحب ان کے پاس بیٹھ گئے اور گاڑی چل پڑی۔جناردھن پرشاد کو یہ سوچ کر قدرے اطمینان ہوا کہ چلو اس کم بخت لڑکے کی جان چھوٹی۔

ایک طویل راستہ طے کرنے کے بعد ایک پل کے قریب گاڑی روک دی گئی۔دونوں افسران نیچے اترے اور اسے لڑکے کو اتارنے کا حکم دیا۔لڑکا نیچے اتر گیا تو ایس۔پی صاحب بے حد سرد لہجے میں اس سے مخاطب ہوئے۔''جاؤ...... بھاگو''!

لڑکے نے بے یقین آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔ان کے سخت اور سپاٹ چہرے سے کسی تاثر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔وہ شدید ذہنی کشمکش میں مبتلا لرزتے قدموں سے پل کی جانب بڑھ گیا۔

ٹھائیں......ٹھائیں......یکا یک پستول سے نکلی ہوئی گولیوں کی تیز آواز سے جناردھن پرشاد کو زور کا جھٹکا لگا۔اس نے بری طرح متوحش ہوکر پھٹی نگاہوں سے دیکھا کہ دونوں گولیاں لڑکے کی پشت میں پیوست ہوگئی تھیں اور وہ پل پر گر کر بے حس وحرکت ہو چکا تھا۔

ایس۔ پی صاحب نے پستول کمر میں کھونسی اور اطمینان سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی واپسی کے لیے مڑ گئی۔

جانے رات کے کس پہر جنار دھن پرشاد کی آنکھیں جھپک گئی تھیں۔ بند آنکھوں میں بھی اس لڑکے کا خون آلود سراپا تیرتا رہا تھا اور وہ نیند میں بھی لرزتا رہا تھا۔ آنکھیں کھلیں تو خاصا دن چڑھ آیا تھا۔ کمرہ خالی تھا۔ شاید دونوں بچے اسکول چلے گئے تھے اور بیوی کچن میں مصروف تھی۔ کھڑکی سے آتی ہوئی تیز روشنی میں کمرے کی ہر شئے واضح اور قابل شناخت تھی۔ اس پر جانے کیسی تکان طاری تھی کہ بدن بالکل نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے بدقت تمام خود کو بستر سے اتارا۔ ناگہاں اس کی نگاہ میز پر رکھے ہوئے اخبار پر پڑی۔ جلی حرفوں میں شائع خبر دور ہی سے چمک رہی تھی۔

''خطرناک دہشت گرد محمد اسلم پولیس مڈبھیڑ میں ہلاک''۔

اس نے لپک کر اخبار اٹھالیا۔ پولیس ذرائع کے حوالے سے خبر شائع ہوئی تھی۔ صرف نام اور مقام کی تبدیلی کے ساتھ وہی جانی پہچانی تفصیل درج تھی جسے وہ بارہا اخباروں میں پڑھ کر نظر انداز کرتا رہا تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ اس خبر سے سرسری نہیں گزر سکا۔ اسے احساس ہوا کہ خبر کا ایک ایک لفظ نشتر بن کر اس کے دل میں چبھ رہا ہے اور وہ اندر سے بری طرح لہولہان ہوتا جارہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے بگولے اٹھنے لگے تھے اور سورج کی تیز روشنی کے باوجود سارے منظر دھندلے پڑنے لگے تھے۔ اس کا دماغ تمازت کرب سے جلنے لگا تھا۔ اس نے کسی طرح اپنے سوختہ وجود کو سنبھالا اور باتھ روم میں داخل ہو کر جسم پر پانی انڈیلنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ قدرے پرسکون ہوا تو اس نے دل ہی دل میں ایک مصمم ارادہ کیا۔

وہ تیار ہو کر گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ عقب سے بیوی کی آواز ابھری۔

''کہاں چلے؟ ناشتہ تو کرلو''۔

اس نے پلٹ کر عجیب سی شکست خوردہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا اور مجروح آواز میں بولا۔

''مجھے دیر ہو جائے گی۔ اگر وقت پر لوٹ آیا تو کرلوں گا''۔ بیوی کو حیران و پریشان چھوڑ

کر وہ انتہائی عجلت میں دروازے سے باہر ہو گیا۔

پولیس محکمے میں نہایت تعجب اور بے یقینی کے ساتھ یہ خبر سنی گئی کہ جنار دھن پرشاد نے عدالت کے سامنے خود سپردگی کر دی تھی۔ اس نے اپنا مکمل بیان درج کرایا تھا۔ اس بے گناہ لڑکے کے قتل میں ملوث افسران کے ساتھ اپنی شرکت کا بھی اعتراف کیا تھا۔ بیان کے بعد اسے عدالتی تحویل میں لے لیا گیا تھا۔

اسے جیل میں پہنچانے کے لیے گاڑی میں بیٹھایا جا رہا تھا کہ جانے کدھر سے ایس۔ پی صاحب نمودار ہوئے اور اس کے قریب چلے آئے۔ انہوں نے سرد لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارے بیان دے دینے سے ہم قانون کی گرفت میں آجائیں گے''؟

''نو سر!'' اس نے بے حد مودبانہ انداز میں سر خم کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے مکمل یقین ہے کہ آپ لوگوں پر قطعی حرف نہیں آئے گا۔ میرے اس حلفیہ بیان کی کیا وقعت ہے؟ آپ لوگ اعلیٰ افسر ہیں اور میں ایک ادنیٰ سا کانسٹبل..........''

''لیکن سر......قدرے توقف کے بعد اس نے شکایت آمیز لہجے میں گہری افسردگی سے کہا۔'' آپ لوگوں نے اتنے بڑے آپریشن میں مجھ جیسے ادنیٰ فرد کو شریک کر کے میرے ساتھ زیادتی کی۔ آپ لوگ تو بڑے آرام وسکون سے جیتے رہیں گے لیکن مجھ غریب کی تو زندگی عذاب ہو گئی''۔

☆☆☆☆☆

زمین

شام ہوتے ہوتے اس نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ ہفتوں کی مسلسل مشقت کے بعد اس کی زمین کاشت ہوگئی تھی۔ اب اس کاشت شدہ زمین پر تخم پاشی کا عمل ہی باقی رہ گیا تھا۔ مٹی سے آلودہ اپنے جسم کو تکتے ہوئے اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ مٹی کے لمس کا بھی ایک اپنا اور گہرا نشہ ہوتا ہے جو مشام جاں میں پہونچ کر روح کو سرشار کر دیتا ہے۔ اس کیلئے کاشتکاری محض ایک کام نہیں تھا بلکہ ایک عبادت تھی۔ ایسی عبادت جو ہر بار اسے ایک نئی اور انوکھی لذت سے ہم کنار کرتی۔ زمین کے کئی روپ ہوتے ہیں اور وہ ہر مرتبہ ایک نئے روپ سے آشنا ہوتا۔ کاشت کی گئی نرم زمین میں جب اس کے پاؤں ٹخنوں تک پیوست ہو جاتے اور زمین گہری وارفتگی میں ان پر اپنے ہونٹ ثبت کرتی تو اس کے رگ و پے میں لطیف سی سہرن دوڑ جاتی اور وہ از خود رفتہ سا ہو جاتا۔

اس نے زمین کے وسط میں کھڑے ہو کر چہار طرف طمانیت بھری نگاہیں دوڑائیں۔ تھوڑی سی زمین تھی تو کیا؟ اپنی تو تھی۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ اس وقت زمین کے تمام اعضاء ڈھیلے اور نرم پڑ چکے ہیں اور وہ گہری آسودگی کے عالم میں اس طرح بکھری پڑی ہے جیسے شب وصال کے بعد کوئی دوشیزہ محوِ خواب ہو۔

زمین، سحر آگیں اور پراسرار زمین، اس کے تمام اسرار کس پر منکشف ہوتے ہیں۔ اس کے سحر میں گرفتار ہو کر کتنے ہی اس کے قرب کے خواہش مند ہوتے ہیں لیکن زمین خود سپردگی کیلئے جس قدر التفات اور وابستگی کی شرط رکھتی ہے اس پر کوئی کوئی ہی کھرا اترتا ہے۔ وہ اپنی خلوص آمیز فطرت سے مجبور ہو کر بانہیں تو سب کیلئے وا کرتی ہے لیکن دل کے نہاں خانے میں داخلے کی اجازت کبھی کو نہیں دیتی۔

اس کے والد نے وصال سے قبل اپنی طویل زندگی کے تجربوں سے حاصل کردہ علم اسے

تفویض کرتے ہوئے کہا تھا۔

''زمین پر جبر نہ کرنا کہ زمین عورت کی طرح نرم و نازک اور حساس ہوتی ہے۔ اور اسی کی مانند مقدس ہوتی ہے کہ تخلیقی عمل سے گزرتی ہے۔ جبر سے اس کی تخلیقی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے یا اس میں ایسا سقم آ جاتا ہے کہ اس کے شکم سے اگنے والے پودوں کی ہئیت ہی بدل جاتی ہے۔

زمین کی تذلیل نہ کرنا کہ زمین بڑی خوددار اور منتقم مزاج ہوتی ہے اور تذلیل کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ اگر کسی طرح وہ اُن کی زد سے بچ جائیں تو ان کی نسل اس کے انتقام کی شکار ہوتی ہے''۔

اپنی زمین پر گھرے سائے پڑتے دیکھ کر اس نے نگاہیں اوپر کیں۔ آسمان پر گھرے کالے بادل چھانے لگے تھے۔ اپنے سابقہ تجربوں کی بنیاد پر اس نے شناخت کیا کہ برسنے والے بادل ہیں۔ ان کے استقبال میں وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ اگر وہ کچھ دیر کھل کر برس جائیں تو زمین کی تکان اتر جائے گی۔

اس نے اپنے سامان کو سمیٹا، زمین پر محبت آمیز الوداعی نگاہ ڈالی اور گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔ کچھ ہی دوری پر اس کی رہائش گاہ تھی۔ اتنی ہی دوری پر کہ وہاں سے وہ اپنی زمین کے مبہم سے نقوش کو دیکھ سکتا تھا۔ گھر میں داخل ہو کر اس نے وہ بیج نکالے جو زمین میں بوئے جانے والے تھے۔ ایک بار پھر باریک بینی سے ان کا جائزہ لیا اور بے حد مطمئین ہو کر نہانے کیلئے چلا گیا۔ ہلکے سے ناشتے کے بعد وہ چائے کا کپ لیے ہوئے دریچے پر آ گیا اور اپنی زمین کی سمت دیکھا۔ زمین پر والہانہ انداز میں جھکے ہوئے بادل شاید اب تک تذبذب کی کیفیت میں تھے۔ آخر یہ کیفیت ختم ہوئی اور بوندا باندی ہونے لگی اور پھر دھیرے دھیرے بارش نے زور پکڑ لیا۔ بارش کے تیز چھینٹے اس کے جسم کو بھگونے لگے تو اس نے ایک گھرے اطمینان کے ساتھ دریچے کو بند کر دیا۔

دوسرے ہی روز سے اس نے اپنی زمین پر تخم ریزی شروع کر دی۔ اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد وہ بڑی شدت سے بیج کے پھوٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ جلد ہی یہ انتظار ختم ہوا اور کچھ ہی دنوں میں کونپلیں نکل آئیں اور ساری زمین سبز لبادے میں ڈھک گئی۔ روزانہ وہ صبح سویرے ہی

اپنی زمین کی طرف آنکلتا اور کونپلوں کے قد و قامت میں کچھ اور اضافہ دیکھ کر فخر و انبساط سے لبریز ہو جاتا۔ ہفتے بھر میں ہی پودے بالشت بھر کے ہو گئے۔ ان کی تیز رفتار نشوونما سے عیاں تھا کہ فصل اچھی ہو گی۔ ممکن تھا کہ فصل اچھی ہی ہوتی اگر وہ واقعہ رونما نہ ہوتا۔

شام کے وقت وہ حسب معمول چائے پیتے ہوئے اپنی زمین کی سمت ہی دیکھ رہا تھا کہ دور گرد و غبار کے بادل اڑتے دکھائی دیئے۔ قدرے توقف کے بعد ہی ان بادلوں کو چیرتے ہوئے چند گھڑ سوار نمودار ہوئے اور اس کی زمین کی طرف بڑھے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا کہ اس کی زمین گھوڑوں کے سموں سے روندی جانے لگی۔ وہ وحشت زدہ سا ساکت و صامت دیر تک اس عمل کو دیکھتا رہا۔ یکا یک اسے لگا کہ زمین کے ہونٹوں سے دلدوز کراہیں نکلی ہوں۔ وہ اضطراری کیفیت میں باہر نکلا اور اپنی زمین کی طرف بھاگا۔ زمین اور اس کی فصل کو روندتے ہوئے گھڑ سواروں نے اسے دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کی راہ روک لی۔ ان میں سے ایک نے کاندھے سے بندوق اتاری اور اس کی نال اس کے سینے پر رکھتے ہوئے دریافت کیا...... ''کہاں بھاگے جا رہے ہو''؟

''میری زمین...... میری فصل......'' وہ ہذیانی انداز میں چلایا تو ان کے ہونٹوں پر خباثت بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

''وہ تو روندی بھی جا چکی۔ اب تمہاری زمین مدتوں تک کوئی فصل اگانے کی جرأت نہ کرے گی''۔

''ظالم...... درندے......'' وہ پاگلوں کی طرح چیخا تھا کہ کسی کی بندوق کا کندہ اس کے سر پر پڑا اور وہ زمین پر گر کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

ہوش آنے کے بعد وہ کافی دیر تک یوں ہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ وہ لوگ چلے گئے تھے اور چہار سمت گہرا اداس سناٹا طاری تھا۔ وہ کسی طرح اٹھا اور لرزتے ہوئے قدموں سے اپنی زمین کے قریب آیا۔ وہاں زندگی کی رمق بھر نشانی بھی باقی نہ بچی تھی۔ سارے نوزائیدہ پودے دم توڑ چکے تھے۔ ان کی کچلی ہوئی لاشوں کو اپنے سینے سے چمٹائے روندی ہوئی زمین وفور غم سے سیاہ پڑ چکی تھی۔ اس نے بے بسی سے آسمان کو تاکا اور اسے محو تماشہ پا کر سینہ کوبی کرنے لگا۔

ڈھیر سارے شب و روز گئے۔ اداس اور ماتم زدہ شب و روز، وہ حزن و یاس کی تصویر بنا گھر کی تنہائیوں میں ہی مقید رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے زخم قدرے مندمل ہوئے اور حواس ذرا درست ہوئے تو اسے اپنی زمین کا خیال آیا۔ اسے حیرانی ہوئی کہ اس دوران اس کے ذہن کے کسی گوشے میں زمین موجود نہیں تھی بس سارے ذہن پر ایک اداس اور بوجھل سا خالی پن مسلط تھا۔ اس نے سوچا کہ غم بھی عجیب ہوتا ہے اپنی انتہا پر مرتکز ہو کر صرف وہی باقی رہ جاتا ہے۔ وہ وقوعہ فراموش ہو جاتا ہے جو اس کے وجود کا باعث بنا تھا۔ اس فراموشی پر اسے گہری ندامت ہوئی اور اس نے از سر نو اپنی زمین کی نگہداشت کا اردہ کیا۔ علی الصباح وہ اپنی زمین کے قریب آیا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ اس کی ساری زمین پر ناگ پھنی کے پودے اُگ آئے تھے۔ اس نے گہرے کرب سے سوچا کہ ایک نرم و نازک اور زرخیز زمین کیلئے اس سے بڑا عذاب کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی کوکھ سے ناگ پھنی کے پودے اُگ آئیں۔ ناگ پھنی کے خاردار پودوں کو تکتے ہوئے اسے لگا کہ وہ خار اس کی روح میں پیوست کر گئے ہوں۔ نوکیلے خاروں کی تیز چبھن کی اذیت سے اس نے چیخنا چاہا تھا کہ یہ احساس اسے خاصا پر سکون کر گیا کہ اب وہ گھڑ سوار اسکی زمین کو اتنی آسانی سے نہیں روند سکتے......

کشتی کے سوار

بارشیں تو اس خطہ زمین کی شناخت تھیں۔ یوں تو سال بھر رم جھم بھواریں پڑتی رہتیں لیکن موسم باراں میں موسلا دھار بارشیں ہوتیں۔ بستی کے لوگوں کیلئے یہ بارشیں کبھی بڑا مسئلہ نہیں بنیں۔ انھوں نے موسم کے مزاج سے مطابقت پیدا کرلی تھی۔ بستی سے دور رہنے والا دریا شاید ہی کبھی خطرناک ثابت ہوا تھا لیکن اس بار خطرے کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ چار دنوں کی مسلسل دھواں دھار بارش سے لوگ کسی قدر فکر مند ہو گئے تھے۔ متلون مزاج آسماں کی ہر ادا سے آشنا بستی کے تجربہ کار بزرگوں نے آگاہ کیا۔

"آسماں کے تیور ٹھیک نہیں۔ وہ تو پوری بستی کو غرقاب کرنے پر آمادہ ہے۔ اس سے قبل کہ وہ دریا کے توسط سے بستی پر ٹوٹ پڑے ہمیں اپنے تحفظ کا انتظام کر لینا چاہئے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم ایک اتنی بڑی کشتی بنا رکھیں جس میں بستی کے تمام افراد سما جائیں"۔

ساری بستی نے ان کی رائے سے اتفاق کیا۔ زوروں کی بارش کے باوجود بزرگوں کی نگرانی میں سارے نوجوان مصروف عمل ہو گئے۔ بڑے بڑے تناور پیڑ کاٹے گئے۔ ان کے مضبوط تنوں اور شاخوں کی تراش خراش کی گئی۔ انہیں تاروں اور رسوں کی مدد سے اس ترتیب سے جوڑا گیا کہ کشتی کے خدوخال واضح ہوتے گئے۔ کشتی کے مکمل ہونے میں تھوڑی سے کسر باقی ہی تھی کہ دریا کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس کی تیز و تند موجیں کناروں کو توڑتی ہوئی بستی کی سمت بڑھنے لگیں۔ تمام افراد نامکمل کشتی پر ہی سوار ہو گئے۔ چند صحت مند نوجوانوں نے پتوار سنبھالے اور تیزی سے لپکتی موجوں کے مقابل صف آرا ہو گئے۔ تبھی کسی کی تیز آواز اُبھری۔

"وہ دیکھو۔ پہاڑ کی جانب سے کوئی آرہا ہے"۔

سب کی نگاہیں پہاڑ سے اترتی گھاٹی کی طرف اٹھ گئیں۔ جس پر کوئی ہیولہ لڑھکتا سا چلا آرہا تھا۔

''پہاڑ پر رہنے والا نوجوان ہے۔ شاید وہ بھی کشتی پر سوار ہونے کیلئے آرہا ہے''۔ کسی نے خیال ظاہر کیا۔

''لیکن اس نے کشتی بنانے میں ہماری کوئی مدد نہیں کی''۔ کسی نے ہلکا سا احتجاج کیا جسے ایک بزرگ نے سختی سے کچل دیا۔

''کیا بکواس ہے؟ وہ تمہارا بھائی ہے۔ کشتی بنانے کے عمل میں وہ شریک ہوا ہو یا نہیں۔ اس کشتی پر اس کا بھی حق ہے''۔

تھوڑی ہی دیر میں سرخ و سپید رنگت اور نرم و نازک خدوخال رکھنے والا ایک بے حد حسین نوجوان کشتی کے نزدیک آپہنچا۔ اس کی پشت پر ایک بڑا بیگ لٹکا تھا جس کے بوجھ سے وہ خفیف سا جھک گیا تھا۔ اس کا جسم برساتی کوٹ میں اور سر کیپ میں بارش سے محفوظ تھا لیکن تیز بوچھاریں چہرے کو بھگو رہی تھیں۔ اس کی جھیل سی گہری آنکھوں سے بے چینی مترشح تھی۔ لوگوں نے نہایت گرم جوشی اور خوش دلی سے اس کا استقبال کیا۔

''اتنی دیر............'' کسی کے استفسار پر وہ اداس لہجے میں بولا۔

''ہم نے سمجھا تھا کہ اس بارش سے ہمارے پہاڑ محفوظ رہیں گے لیکن..........''

''فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ وقتی پریشانی ہے۔ ہم ایک بار پھر اپنے گھروں میں ہونگے''۔ ایک شخص نے اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

وہ کشتی پر چڑھا تو قریب بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس کیلئے جگہ بنائی لیکن اسے نظر انداز کرتا ہوا وہ دوسرے کنارے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں پہلے سے موجود ایک نوجوان اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی پشت سے بیگ اتار کر رکھا اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ جب دریا کی موجوں نے آگے بڑھ کر کشتی کو اپنے شانوں پر اٹھالیا تو پتوار چلنے لگے اور کشتی پانی کی سطح پر آگے بڑھنے لگی۔

''اس بیگ میں کیا ہے؟'' بغل میں بیٹھے ایک بے حد عمر رسیدہ شخص کے مخاطب کرنے پر لاتعلق سا بیٹھا ہوا پہاڑی نوجوان چونک پڑا۔

''پہاڑ کے چند قیمتی ٹکڑے ہیں اور کچھ دوسری ضروری سامان.........''

''پہاڑ پر حالات کیسے ہیں؟'' پہاڑ کے نام پر بوڑھے کو جیسے کچھ یاد آتا۔اس سوال پر نوجوان کے نرم چہرے پر کرختگی پھیل گئی۔

''کیا آپ لوگ نہیں جانتے ؟اس ملک کے کتوں نے اس جنت کو جہنم میں تبدیل کر دیا ہے''۔

''صبر اور حوصلہ رکھو بیٹے''۔بوڑھے نے غم خوار لہجے میں دلا سا دیا۔''اوپر والے نے چاہا تو جلد ہی تمہاری تحریک آزادی کامیاب ہو گی''۔

ان کے مخالف کنارے پر موجود ایک دراز قد اور مضبوط جسم والا نوجوان جس کے بازوؤں کی سخت مچھلیاں پتوار چلاتے ہوئے ابھر آئی تھیں اور ان پر پانی کی تیز دھار پھسل رہی تھی، بے ساختہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔کشتی پر موجود تمام لوگ جنہیں پہاڑ سے گہرا جذباتی لگاؤ تھا۔ہم مذہب ہونے کے باعث وہاں کے لوگوں سے گہری محبت اور انسیت تھی اور جو پہاڑ کی ناگفتہ بہ حالت کے تذکرے پر خاصے دل گرفتہ ہو گئے تھے۔اس بے محل قہقہے پر چونک کر اس کی سمت دیکھنے لگے۔ان سے بے نیاز وہ بوڑھے کو تمسخر آمیز نگاہوں سے تکتا ہوا بولا۔

''ہم نے آپ جیسی بے وقوف نسل دنیا میں نہیں دیکھی''۔

اس کے جملے اور لہجے کی تیز چبھن سے بوڑھا شخص بری طرح برافروختہ ہو گیا۔''تم نہایت گستاخ اور بدتمیز نوجوان ہو''۔

''نہیں ہم گستاخ نہیں حقیقت پسند ہیں''۔دراز قد نوجوان بالکل سنجیدہ ہو گیا۔''آپ اسے کس آزادی کی دعا دے رہے ہیں؟ کیا برسوں پہلے جان و مال کی قربانیاں دے کر ملک کو تقسیم کرنے کے باوجود بھی آپ کی نسل کو عقل نہیں آئی جو ایک بار پھر تقسیم کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ ملک کی تقسیم سے آپ لوگوں کو کیا ملا؟ یہاں غدار اور وہاں مہاجر کی گالیاں۔آپ لوگوں کے خون سے سینچے چمن میں دوسرے دادِ عیش دے رہے ہیں۔اور آپ کی نسل اپنے حق کی خاطر اب تک برسرِ پیکار ہے۔لیکن ہماری موجودہ نسل اس بھیانک غلطی کو نہیں دوہرائے گی۔ہم اپنے ملک کو دوبارہ تقسیم نہیں ہونے دیں گے''۔

اس کی آواز میں کچھ ایسی سختی اور پختگی تھی کہ بوڑھا شخص سٹپٹا کر رہ گیا۔ بارش کا زور ٹوٹنے لگا تھا لیکن دریا پورے اپھان پر تھا۔ اس نے کشتی کے لوگوں پر نگاہیں دوڑائیں۔ شاید اسے توقع تھی کہ ان میں سے بیشتر افراد اس کے ہم خیال ہونگے لیکن ہر ایک چہرہ اسے اپنا مخالف لگا تو اس نے شکست خوردگی کے انداز میں سر کو جھکا لیا۔ لیکن پہاڑی نوجوان اس کی باتوں سے خاصا مشتعل ہو کر بولا۔

''ہمیں تو مذہبی بنیاد پر آپ سے حمایت کی امید تھی لیکن آپ ہمارے دشمنوں کی زبان میں باتیں کر رہے ہیں''۔

''تمہارے دشمن کون ہیں؟ جنہوں نے تمہیں خصوصی مراعات دے رکھی ہیں، تمہارے مذہبی تشخص اور تہذیبی وراثت کو محفوظ رکھا ہے، تمہاری زمینوں پر دوسروں کو بسنے کی اجازت نہیں دی ہے،، ہم وطنوں کا پیٹ کاٹ کر تمہاری شکم سیری کی ہے، کیا وہ تمہارے دشمن ہیں؟''

''اور ان کے کتے جو برسوں سے ہماری بوٹیاں نوچتے رہے ہیں، ہمارے بے قصور بھائیوں کا قتل اور ہماری پاکیزہ بہنوں کی آبروریزی کرتے رہے ہیں، ان کا ذکر کیوں نہیں کرتے؟'' پہاڑی نوجوان کے لہجے میں خاصی تلخی تھی۔

''وہ وطن کے پاسبان اور ہمارے محافظ ہیں۔ ہمارا سابقہ بھی ان سے اکثر پڑتا رہا ہے۔ اپنے تجربوں کی روشنی میں ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ان پر یہ جھوٹے بہتان ہیں۔ اکا دکا اس طرح کے واقعے پیش آئے بھی ہوں تو وہ عام مثال نہیں بن سکتے ہیں''۔

''اور پھر تم نے کب اپنے خلوص اور نیک نیتی کا مظاہرہ کیا ہے؟ اکثریت کے زعم میں مبتلا خود کو ہمیشہ اعلیٰ اور علاحدہ ہی تصور کرتے رہے۔ صدیوں سے آباد چھوٹی سی اقلیت کو بھی برداشت نہیں کر پائے۔ اس ملک کی نرمی اور رواداری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک دشمن دراندازوں کو پناہ دی۔ انہیں دہشت گردی پھیلانے کی اجازت دی۔ سب سے بڑی بے وقوفی یہ کی کہ اپنا ہمدرد سمجھ کر اس خود غرض اور منتقم مزاج کھلاڑی کے مہرے بن بیٹھے جس کا ایک ہی مقصد ہے۔ ہمارے ملک کو مات دینا۔ کسی بھی طرح، کسی بھی قیمت پر، اس بازی میں تمہارے جیسے مہروں کے پٹنے کا اسے کوئی غم نہیں''۔

''تمہاری نظر میں وہ خود غرض کھلاڑی ہوگا اور ہم بساط کے مہرے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ ہمارا سچا ہمدرد اور بے لوث مددگار ہے''۔ پہاڑی نوجوان اعتماد و اعتبار کی اونچی فصیل پر فروکش تھا۔''اور پھر پاک سرزمین کے رہنے والے ہمارے مذہبی بھائی ہیں، وہ ہمارے ہمدرد کیوں نہ ہونگے''۔

درازقد نوجوان ایک بار پھر استہزائیہ انداز میں ہنس پڑا۔

''انہیں ہمدردی ہی دکھانی ہے تو ان کیمپوں میں جا کر کیوں نہیں دکھاتے جہاں ان کے نام پر قربانیاں دینے والے مذہبی بھائیوں کی دوسری نسل بھی بے سروسامانی کے عالم میں جوان ہونے کو ہے۔ تم تو ان کے وجود میں آنے کی لڑائی میں انگلی کٹا کر بھی شامل نہیں ہوئے تھے پھر بھی وہ احسان فراموش تم پر اتنے مہرباں ہیں۔ جانتے ہو اس مہربانی کی اصل وجہ کیا ہے؟ تم ہو خوبصورت اور نوخیز لونڈے......اور وہ ٹھہرے عیاش طبع لوگ''۔

پہاڑی نوجوان اچھل کر کھڑا ہو گیا اور غصے کی زیادتی سے کپکپاتا ہوا چیخا۔''تم ہمیں اور پاک سرزمین والوں کو گالیاں دے رہے ہو''۔

''ہم تو تمہارے حسن کی تعریف کر رہے ہیں۔ رہا سوال پاک سرزمین والوں کا، تو ان کی پاکی کے کیا کہنے؟ جس سرزمین پر عبادت گاہوں کو بھی اپنے ہی بھائیوں کے خون سے غسل دیا جاتا ہو، اس سرزمین پر رہنے والے تو فرشتوں کی طرح ہی پاک و معصوم ہوں گے''۔

گرچہ درازقد نوجوان نے یہ بات ہنستے ہوئے پر مزاح انداز میں کہی تھی لیکن بات میں حقیقت کی ایسی کاٹ تھی کہ سبھی کسمسا کر رہ گئے۔ ظالم اور کینہ پرور لوگ! مذہب کے سچے پیروکار ہونے کا دم بھرتے ہیں اور عبادت خانوں کے تقدس کو بے گناہوں کے خون سے پامال کرتے ہیں۔ سبھی کی گردنیں جھک گئی تھیں۔ جیسے ہم مذہب ہونے کے ناطے ہر غسل پاک میں ان کی بھی شرکت رہی ہو۔ سبھی مہر بہ لب تھے۔ بارش رک چکی تھی اس لئے خاموشی کا احساس کچھ زیادہ ہی گہرا تھا۔ صرف پتواروں کی چھپ چھپ کی آواز تھی جس میں اس قدر تسلسل تھا کہ وہ بھی خاموشی کا حصہ ہی جان پڑتی تھی۔ قدرے توقف کے بعد اسی نوجوان نے خاموشی کی گردن مروڑی۔

''تمہارا وجود ہماری بقا کا ضامن ہے۔ تم ہمارے جسم میں پُر فخر سر کی حیثیت رکھتے ہو۔ بھلا کون بے وقوف اپنے ہی سر کو کٹنے دیگا۔ تم اور تمہارے نام نہاد ہمدرد اچھی طرح ذہن نشیں کرلیں کہ ہم تمہارے معاملے میں لاتعلق نہیں رہ سکتے، رہ ہی نہیں سکتے۔ تم ساٹھ لاکھ میں سے صرف پانچ دس لاکھ لوگوں کو ہم بیس کروڑ افراد کی قسمت سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی''۔

''ہم کسی کی اجازت کے پابند نہیں''۔ پہاڑی نوجوان کے لہجے میں رعونت اور خودسری تھی۔ ''ہمیں پاک سرزمین والوں کی طاقت اور صداقت پر کامل اعتماد ہے۔ ان کے عملی تعاون سے ہم اس مذہبی جنگ میں یقیناً کامیاب ہونگے''۔

''خاموش!'' دراز قد نوجوان اس قدر برہم ہوا کہ اس کے ہاتھ سے پتوار چھوٹ گیا۔

''تم کس مذہبی جنگ کی بات کررہے ہو؟ کیا تم مذہبی جنگ کے مفہوم سے بھی آشنا ہو؟ تم اپنی شرمناک دہشت گردی کو مذہبی جنگ کا نام دے کر اپنی قوم کے ساتھ مذہب کا بھی نقصان عظیم کر رہے ہو۔ کیسی مذہبی جنگ......؟ کیا یہاں تمہارے مذہبی حقوق کو کبھی سلب کرنے کی کوشش کی گئی؟ کیا تمہاری عبادت میں کبھی رخنہ اندازی کی گئی؟ کیا تمہیں اپنے مذہب کی تبلیغ و توسیع اور تعلیم و تربیت سے کبھی روکا گیا؟ کیا تم پر کسی اور مذہب کو زبردستی تھوپنے کی سازش کی گئی؟ پھر کیسی مذہبی جنگ؟......کیا بے گناہ غیر مسلح لوگوں کے ساتھ معصوم بچوں تک کا قتل عام مذہبی جنگ ہے؟ کیا اپنی عبادت کی مقدس راہ پر گامزن عقیدت مندوں کو گولیوں اور بموں سے ہلاک کر ڈالنا مذہبی جنگ ہے؟ آخر یہ کیسی مذہبی جنگ ہے، جس میں ہم مخالف صف میں کھڑے ہیں۔ کیا ہم تمہارے ہم مذہب نہیں؟ کیا ہمارا مذہبی علم تمہارے مذہبی علم سے کمتر ہے یا ہمارے اندر مذہبی جذبے کی کمی ہے؟''

''تمہارا معاملہ تم جانو!'' پہاڑی نوجوان دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ ہمیں غیر مذہبوں کا تسلط منظور نہیں۔ اس تسلط کے خلاف خونی جدوجہد مذہبی جنگ ہی ہے''۔

''یہ تمہاری گمرہی ہے کہ جمہوری آزادی اور خصوصی درجے کو تسلط قرار دیتے ہو۔ تمہیں اپنے ہم مذہبوں کا تسلط چاہئے۔ شاید اپنے ہمدرد فوجی آمروں کی طرح یا پھر جنگجو اور جاہل طالب علموں کی طرح.........''

''لیکن اس احمقانہ جدوجہد میں تم اور تمہارے ہمدرد ایک بات فراموش کر رہے ہیں کہ اس معاملے میں ہم بھی فریق ہیں۔ سب سے اہم اور بنیادی فریق...... ہماری پرانی نسل کی حمایت اور جذباتیت کے بغیر تمہارے ہمدرد کا الگ وجود میں آنا ممکن نہیں تھا اور ہماری موجودہ نسل کی مخالفت اور حقیقت پسندی کے باعث تمہارا الگ وجود میں آنا ممکن نہیں''۔

پہاڑی نوجوان نے سر جھٹک کر اس کی باتوں سے بے پرواہی ظاہر کی اور اوپر آسمان کو تکنے لگا جہاں بادل کے باقی ماندہ چند ٹکڑے اپنے انتشار پر حیران و پریشان تھے۔ ماحول پر ایک بار پھر کشیدگی آمیز خاموشی کی چادر تن گئی۔ جن لوگوں نے کشتی پر پہاڑی نوجوان کا گرم جوشی سے استقبال کیا تھا اب وہی اس سے بدظن تھے تمام لوگ اس کی باتوں سے غیر متفق اور ناخوش تھے۔ حالانکہ بارش رکے دیر ہو چکی تھی لیکن پانی...... حیات افروز پانی...... مختلف الاشکال والا پانی...... اپنی سب سے کریہہ اور بھیانک شکل میں چہار سمت اپنے بازوؤں کو پھیلائے چنگھاڑ رہا تھا۔ اس کے زوردار تھپیڑوں سے نامکمل کشتی کسی حد تک شکستہ ہو چکی تھی لیکن فوری طور پر خطرے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پتوار سنبھالے نوجوان تیز و تند موجوں کے سامنے سینہ سپر تھے گہرے پانی میں ڈوب چکی ان کی بستی کا دور تک نام و نشان نہ تھا۔ پھر بھی سارے پر یقین تھے کہ جلد ہی دریا اترے گا اور انہیں خشکی کا لمس حاصل ہو جائے گا۔

اچانک کچھ لوگوں کی نگاہیں دور ایک ایسی شئے پر مرکوز ہوئیں جس کا حجم آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پہاڑی نوجوان نے اپنے بیگ سے دوربین نکالی اور اپنی آنکھوں سے لگائی، یک لخت وہ خوشی سے چلا اٹھا۔

''سبز پرچم...... پاک سرزمین والوں کا جہاز......''

سب نے اس شئے کو بغور دیکھا، شاید جہاز ہی تھا۔ لیکن پہاڑی نوجوان کی طرح ان کے چہروں پر خوشی کا کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ دوسرے ہی لمحے پہاڑی نوجوان کی آواز مایوسی میں ڈوب گئی۔

''لیکن اس جہاز کا رخ دوسری طرف ہے''۔

اس دوسری اطلاع پر بھی لوگوں کی جانب سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا تو اس نے

آنکھوں سے دوربین ہٹائی اور انہیں تکا۔ بے تاثر چہروں کے ساتھ سب اسی کی طرف متوجہ تھے وہ قدرے جھجکتا ہوا بولا، ''کشتی کو اس جہاز کی طرف لے چلو......؟''

''کیا وہ ہم سب کو اپنے جہاز پر قبول کر لیں گے؟'' دراز قد نوجوان نے سوال کیا تو وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مذہبی بھائی ہونے کا دعویٰ کرنے والے وہ ناسپاس لوگ ہمیں قبول نہیں کریں گے اور نہ ہی ہم ان سے مدد مانگنا گوارا کریں گے''۔

''تو پھر ہمیں اس جہاز تک پہنچا دو۔ اس شکستہ کشتی کا کوئی بھروسہ نہیں''۔ اس نے جیسے فریاد کی۔

''کبھی کبھی صحیح و سالم جہاز ڈوب جاتا ہے اور شکستہ کشتی ساحل سے لگ جاتی ہے''۔ کوئی بڑبڑایا۔

''یہ کشتی اپنی راہ ہی چلے گی اور تم ہمارے ساتھ ہی رہو گے''۔ دراز قد نوجوان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ہم اس جہاز میں جائیں گے اور ہمیں تمہاری مدد کی بھی ضرورت نہیں''۔ پہاڑی نوجوان کی آواز میں عجیب سا عزم تھا۔

اس نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ جب اس کا ہاتھ باہر نکلا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں ربڑ کی بڑی سی لائف ٹیوب اور ایئر پمپ موجود ہے۔ اس نے ٹیوب کی نلکی میں پمپ کو فکس کیا اور تیزی سے ہوا بھرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں لائف ٹیوب کی سطح پھیل کر کیلے کے تنے جیسی موٹی اور چکنی ہو گئی۔ ٹیوب کی نلکی کو کستے ہوئے اس نے لوگوں پر فاتحانہ نگاہیں ڈالیں تو دراز قد نوجوان کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیمے لیکن مضبوط قدموں سے چلتا ہوا پہاڑی نوجوان کے قریب جا پہنچا۔ کچھ دیر تک اسے تیز نگاہوں سے تکتا رہا۔ یکا یک اس نے اپنی کمر میں کھونسا ہوا خنجر کھینچا اور اس سے قبل کہ دہشت زدہ پہاڑی نوجوان اس کی نیت کا اندازہ لگا پاتا، خنجر کی تیز نوک لائف ٹیوب

میں پیوست ہوگئی۔اور پھر خنجر ٹیوب کو چیرتا چلا گیا۔ ہوا نکلی تو ٹیوب پچک کر رہ گئی۔

پہاڑی نوجوان کی آنکھوں کے سامنے خنجر کو لہراتا ہوا دراز قد نوجوان برف سے زیادہ سرد آواز میں بولا۔

''تم ہمیں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ ساحل سے لگیں یا بھنور میں ڈوبیں، ہمارا انجام بھی ایک ہوگا''۔

☆☆☆☆☆

وہ بچے ہی تھے

’’میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں کہ وہ بچے نہیں تھے۔ ہماری سرکار پر تو حقوق انسانی کمیشن کا ایسا خوف سوار ہے کہ وہ اس بھیانک سچائی کو بھی قبول کرنے میں جھجک رہی ہے۔ یہ سرکاری ڈاکٹر بھی بالکل نااہل اور کام چور ہیں یا پھر ممکن ہے کہ ان پر بھی سرکاری سطح پر دباؤ ڈالا گیا ہو۔ آپ تو اخبار والے ہیں آپ لوگ تو بال کی کھال نکالنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ آپ ہی کیوں نہیں اس حقیقت کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے ہیں؟

کیا؟ آپ بھی یقین کرتے ہیں کہ میں سزا سے بچنے کیلئے ایک من گھڑت اور نا قابل یقین واقعے کی طرف لوگوں کے ذہن کو بھٹکانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ نے میرا اقبالیہ بیان پڑھا ہے کیا؟ اس بیان کو پڑھکر ایسا لگتا ہے کہ خود کو بچانے کیلئے میں نے واقعے میں کسی طرح کا ردو بدل کیا ہے۔ اور پھر میں ایسا کیوں کروں؟ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس پر مجھے ذرا بھی ندامت یا احساس جرم نہیں ہے۔ میں نے یہ سب دیش کی خاطر اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ اب اس کے بدلے میں مجھے پھانسی کی سزا بھی ملے تو کوئی گلہ نہیں۔ افسوس تو صرف اتنا ہے کہ ہماری سرکار پتہ نہیں کس سیاسی مجبوری کی بنا پر اس خوفناک صورت حال سے مجرمانہ چشم پوشی کر رہی ہے۔

اگر آپ سننے کے خواہش مند ہیں تو میں واقعات کی ساری تفصیل آپ سے بیان کرتا ہوں۔ یہ سب اس مہانگر کے بیچوں بیچ بسی ’’آزاد بستی‘‘ میں ہوا۔ آپ وہاں گئے ہیں یا نہیں؟ میڈیا والوں کیلئے تو آج کل وہ بستی اچھی خاصی تفریح گاہ بن گئی ہے۔ جسے دیکھو منھ اٹھائے ادھر ہی چلا جا رہا ہے۔ اگر آپ نہیں گئے ہیں تو اس بستی کے بارے میں تھوڑا بہت جان لیجئے۔ اس عظیم اور خوبصورت شہر کے جسم میں کسی ناسور کی طرح وہ بستی موجود ہے۔ وہاں جا کر آپ یقین نہیں کر پائینگے کہ وہ بستی بھی اسی مہانگر کا ایک حصہ ہے۔ تنگ اور گندی گلیاں، بدبو اور غلاظت اگلتی نالیاں، بے

ترتیبی سے بنے کچے پکے گھر اور ان گھروں میں جانوروں سے بدتر زندگی گزارتے ہوئے لوگ، اتنی گنجان آبادی کہ ایک فرد کے حصے میں دو گز زمین بھی مشکل سے آئے گی۔ پتہ نہیں ان لوگوں کو آبادی بڑھانے کے علاوہ کوئی اور کام ہے کہ نہیں۔ جتنے لفڑے اس اکیلی بستی میں ہوتے ہیں پورے مہانگر میں بھی نہیں ہوتے۔ ہم لوگوں کا زیادہ تر وقت اسی بستی میں گذرتا ہے۔ جرائم کیلئے بے حد زرخیز اور مجرموں کیلئے بہترین پناہ گاہ ہے وہ بستی۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مجرم اس شہر کے دوسرے علاقوں میں بھی موجود ہیں لیکن ان کی سطح اتنی بلند ہے کہ ہم جیسے چھوٹے موٹے پولیس والے تو ان کی دہلیز پر پاؤں بھی نہیں رکھ سکتے۔ ہم جیسے پولیس والوں کو تو ذہنی آسودگی اور تسکین وہیں ملتی ہے۔ ازلی غلاموں کی مانند ان کے خوف زدہ چہرے اور خمیدہ جسم کو دیکھ کر جو فخر کا احساس ہوتا ہے وہ دوسرے علاقوں میں کہاں؟ اس بستی میں میرے جیسا سب انسپکٹر بھی مہاراجہ سے کم نہیں ہوتا۔ ہماری خاکی وردی کو دیکھتے ہی وہ لوگ اس طرح ساکت اور خاموش ہو جاتے جیسے پتھر کے مجسمے ہوں۔ کوئی فقط آنکھ کے اشارے پر کتے کی طرح دم ہلاتا ہوا دوڑا آتا تو کوئی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی سے ہی شیر کی طرح سینہ تان لیتا۔ وہ لوگ ہمیں خوش کرنے کیلئے طرح طرح کے کرتب دکھاتے۔ شراب اور شباب سے تواضع کی جاتی اور واپسی کے وقت اچھی خاصی رقم بھی پیش کی جاتی۔ ان پر یہ پولیسیا رعب اور دبدبہ قائم کرنے کیلئے ہمیں بے حد محنت کرنی پڑتی۔ ہفتے عشرے میں کسی بھی لونڈے کو کوئی نہ کوئی الزام لگا کر گرفتار کرلیا جاتا۔ تھانے میں لاکر ان کی اچھی خاصی مہمان نوازی کی جاتی۔ ضمانت پر رہا ہوتے ہوتے ان کی ایسی درگت بنادی جاتی کہ مہینوں چارپائی پکڑ لیتے۔ کوئی کوئی اس کی تاب نہ لاکر مر بھی جاتا اور ان کے دلوں میں ہماری دہشت کچھ اور بڑھ جاتی۔ کبھی کبھی کوئی سرپھرا ہمارے خلاف سر اٹھانے کی جرات کرتا تو فرضی انکاؤنٹر میں مارا جاتا۔ ہینگ لگتی نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آتا۔

لیکن یہ سب تو چھوٹے چھوٹے واقعات تھے جن سے وقتی طور پر تو دہشت پھیل جاتی لیکن یہ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ اصل ضرورت تو اس بات کی تھی کہ انہیں اجتماعی طور پر اس طرح کچلا جاتا کہ مدتوں پھن اٹھانے کی ہمت نہ ہو۔ خوش قسمتی سے کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جاتا یا کرادیا جاتا کہ

مختلف مذہب والے آپس میں ٹکرا جاتے اور اس کی آڑ میں ہم انہیں ایسا سبق پڑھاتے کہ ان کی نسلیں بھی یاد رکھتیں۔

کیا؟ یہ ظلم اور بربریت ہے۔ آپ کو ایسا لگتا ہے تو لگے لیکن میں سانپوں کو دودھ پلانے کا قائل نہیں۔ آپ جیسے لوگوں نے ہی انہیں سر پر چڑھا رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انہیں یہاں رہنے کا کیا حق ہے؟ صدیوں انہوں نے ہم پر حکومت کی، ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، جبری مذہب تبدیل کروایا، جزیہ لگایا اور آخر میں دیش کو بانٹ کر اپنا حصہ بھی لے لیا پھر بھی یہ لوگ یہیں ہمارے سینوں پر سوار ہیں۔

دیکھئے! مجھے تاریخ سمجھانے کی کوشش مت کیجئے۔ ہمارے کورس کی کتابوں میں بھی تاریخ کا باب رہا ہے۔ ان کتابوں میں ان کے متعلق جو رقم ہے انہیں جاننے کیلئے وہی کافی ہے۔ اچھا چھوڑیئے تاریخ کے سبق کو، میں تو اتنا جانتا ہوں کہ یہ دیش ہمارا ہے۔ صرف ہمارا۔ اگر کوئی دوسرا یہاں رہتا ہے تو اسے ہمارے رحم وکرم پر ہی رہنا ہوگا۔ دیکھئے غیر ضروری بحث میں ہم اپنے موضوع سے ہی بھٹک گئے۔

ہاں تو میں اس واقعے کے متعلق بتانے جا رہا تھا جو اس روز پیش آیا۔ یہ تو آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے کہ کچھ عرصے سے ان سانپوں کیلئے دوسرے ملک سے زہر کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ اپنے دیش کو ان کے زہر سے محفوظ رکھنے کیلئے ایک ماسٹر پلان بنایا گیا۔ دیش میں ہر مخدوش جگہ پر مذہبی فساد کروایا گیا۔ اور اسی بہانے ہماری حفاظتی فورس نے ان کے اٹھے ہوئے پھن کو پوری طرح کچل ڈالا۔ یہاں بھی ایسا ہی کیا گیا۔

ایک چھوٹا سا واقعہ ہماری حکمت عملی سے بھیانک فساد میں تبدیل ہوگیا۔ اور ہمیں کھل کھیلنے کی مکمل آزادی مل گئی۔ ہفتہ بھر تک لوٹ مار اور قتل وغارت گری کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے بعد ہم نے انہیں آخری سبق پڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ آدھی رات گئے ہماری فورس اور ہماری ہی وردیوں میں ملبوس ہمارے غنڈوں نے اس بستی پر دھاوا بول دیا۔ توقع کے عین مطابق ہمیں برائے نام مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور ہم من مانے طریقے سے اپنے کام میں مشغول ہوگئے۔ سینکڑوں

سانپوں کے زہریلے وجود سے زمین کو پاک کیا گیا۔ صد ہا نا گنوں کے تنے ہوئے پھن کو اپنے زانوؤں پر جھکا کر ان کا غرور توڑا گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں زخمی سانپ ہمارے بوٹوں پر اپنی پیشانیاں رگڑنے لگے۔ اس اہم فریضے کو انجام دے کر فاتح فوج کی طرح ہم فخر سے سینہ تانے ہوئے بستی سے باہر نکلے۔ گلی کی نکڑ پر ایک مضحکہ خیز منظر ہمارا منتظر تھا۔ وہاں دس سے بارہ برس کے ڈھیر سارے لونڈے کھڑے تھے۔ ہم نے سمجھا کہ بستی میں ہونے والے خون خرابے سے ڈر کر وہ سب گھروں سے بھاگ آئے ہیں۔ دل میں ایک خیال آیا کہ ان سنپولوں کو بھی دھرتی ماتا پر قربان کر دیا جائے۔ پھر سوچا۔ ہٹاؤ۔ جانے دو۔ جائینگے کہاں؟ کچھ عرصہ بعد ہمارے ہی بوٹوں تلے آئینگے۔

ان کے قدرے قریب پہنچنے پر ہم ذرا چونکے۔ بجلی کے کھمبے سے لٹکے بلب کی پیلی روشنی میں نظر آیا کہ سب کے ہاتھوں میں کچھ نہ کچھ کھیل کا سامان موجود ہے۔ کسی کے ہاتھ میں گلی کھیلنے والا ڈنڈا تھا تو کسی کے ہاتھ میں غلیل۔ کوئی کرکٹ کا بلا تھامے ہوئے تھا تو کوئی پتنگ اڑانے والی چرکھی۔ ہم نے انہیں بھگانے کیلئے بوٹوں کو زمین پر پٹختے ہوئے فحش گالیاں بکیں۔ لیکن وہ سب بھاگنے کی بجائے ہماری ہی طرف بڑھنے لگے۔ ہم نے لاٹھیاں چمکائیں لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ان کے اور قریب آنے پر ہم کچھ زیادہ ہی چونکے۔ ہم نے دیکھا کہ ان کے چہرے پتھر کی طرح سخت اور جامد تھے۔ ان میں زندگی کی ذرا سی بھی حرکت نہیں تھی لیکن ان کی پتلیوں میں تیز چنگاریاں سی بھڑک رہی تھیں۔ ہماری سمت بڑھتے ہوئے ان کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور وہ حملہ آور ہونے کی حالت میں تھے۔ کچھ پل ہم تعجب سے انہیں تکتے رہے پھر ان پر لاٹھیاں برسانے کا حکم دے دیا۔ لاٹھیاں برسیں۔ لیکن یہ کیا؟

لاٹھیاں ان کے جسم سے یوں ٹکرائیں مانو پتھر سے ٹکرائی ہوں۔ ان کا کچھ بگاڑنے کی بجائے اکثر لاٹھیاں ہی ٹوٹ گئیں۔ وہ لونڈے اسی طرح آنکھوں میں چنگاریاں لئے ہماری جانب بڑھتے رہے۔ سچ پوچھئے تو ہم تھوڑے سے خوفزدہ ہوئے۔ کچھ پیچھے ہٹتے ہوئے ہم نے آنسو گیس کے گولے پھینکے اور پھر بے ہوش کرنے والی گولیاں داغیں لیکن حیرت انگیز طور پر ان سب کا انجام

بھی وہی ہوا۔ ان پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ اور وہ اسی طرح آگے بڑھتے رہے۔ تب ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ بچے نہیں ہیں بلکہ بچوں کے روپ میں جدید ترین روبوٹ ہیں جو یقینی طور پر غیر ملک سے ہی درآمد کئے گئے ہوں گے۔ آخری ہتھیار کے طور پر ہم نے بندوقیں تان لیں اور ان کے سر اور سینوں کا نشانہ لیتے ہوئے گولیوں کی بارش کر دی۔ خوش قسمتی سے گولیوں نے ہمیں مایوس نہیں کیا اور وہ ایک ایک کر کے بے جان ہو کر زمین پر گرتے چلے گئے۔ اب آپ ہی بتایئے۔ ہم نے کوئی گناہ یا جرم کیا ہے۔ لیکن ہماری سرکار تو ان روبوٹوں کو سچ مچ کے بچے ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اسے اس کی بھی فکر نہیں کہ اس واقعے کو نظر انداز کرنے کے کتنے خوفناک نتائج نکل سکتے ہیں۔

ذرا سوچئے! کل اگر ان لوگوں نے بچوں کے روپ میں ایسے روبوٹ درآمد کر لیے جن پر گولیاں بھی اثر انداز نہیں ہوں گی تب.....تب کیا ہوگا؟..............................

☆☆☆☆☆

ایک بیل کی سرگذشت

''میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ خوف زدہ ہوکر کیوں بھاگ گئے؟ نہیں جناب! میں نے کچھ نہیں کیا۔ بھلا میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟ میں تو ایک بیل ہوں اور وہ میرے مالک ہیں۔ اب مالکوں کے خلاف میرے جیسا جانور کچھ کرنے کی سوچ بھی لے تو بھلا کرنے کی طاقت کہاں سے لائے گا؟ چلئے میں مان لیتا ہوں کہ میرے جیسے جانوروں کیلئے مالکوں کے خلاف سوچنا بھی گناہ ہے لیکن سوچ تو بند مٹھی میں چھپی دھول کی طرح ہے۔ جب تک ظاہر نہ ہو اس کی تہیں کسی چہرے پر نہیں جم سکتیں اور اپنی مٹھی کھولنے کی کس میں سکت ہے؟

دیکھئے! میں نے آج تک کچھ کہا، کسی بات کی شکایت کی، جو دیا گیا، کھالیا، جس کام میں لگایا گیا لگ گیا۔ کبھی کسی محنت سے جی چرایا ہے میں نے۔ حالانکہ کبھی کبھی دل کے نہاں خانے میں کسی دریچے سے سانپ کی طرح رینگتا ہوا یہ خیال پہنچ جاتا ہے کہ زمیں تو اللہ نے بنائی ہے اور اس کے سینے میں گھاس پھوس بھی اسی نے پیدا کیے ہیں پھر انہیں حاصل کرنے کیلئے کیسی محنت اور کیسا مالک؟ مگر دوسرے ہی پل اپنی اس سوچ پر پشیمان ہو جاتا ہوں۔ اب یہ تو میرے جیسا بیل بھی جانتا ہے کہ یہاں سبھی اپنی قسمت کا لکھا بھوگتے ہیں اور کاتب تقدیر بھی تو وہی اللہ ہے۔ اب یہ تو پتھر پر لکھی ہماری تقدیریں ہیں کہ دو وقت کی گھاس بھی حاصل کرنے کیلئے صبح سے شام تک جی جان ایک کرنا پڑتا ہے۔ نہیں بھئی! میں اپنے ذمے کے کام کی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو بیل ہوں۔ بیل کام نہیں کرے گا تو کیا کرے گا؟ اگر میرے مالک یہاں موجود ہوتے تو میں اپنے محنتی ہونے کی گواہی انہیں سے دلواتا۔ لیکن پتہ نہیں وہ خوفزدہ ہوکر کدھر بھاگ گئے؟

میری خوش قسمتی ہے کہ آپ لوگ اپنی زندگی کا قیمتی وقت میرے جیسے جانور کی باتوں کو سننے میں صرف کر رہے ہیں۔ میری خواہش ہو رہی ہے کہ اس موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی کی کہانی

آپ کے گوش گزار کر دوں۔

سچ کہا آپ نے، میری کہانی بھی کوئی کہانی ہے۔، بے رس اور بے رنگ، اس کہانی کو سننے سے بہتر ہے کہ آپ اپنا قیمتی وقت کسی کلب یا قمار خانے میں گزار دیں۔ لیکن جتنی محویت اور دلچسپی سے آپ یہاں کھڑے ہیں مجھے یقین ہے کہ میری بور سے بور باتیں بھی آپ کو یہاں سے ہٹا نہیں سکتی ہیں۔

اچھا تو سنئے صاحبان! مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے پیدا ہوا اور میں کس کا نطفہ ہوں۔ شاید اس بارے میں میرا مالک کچھ جانتا ہو لیکن وہ تو...... خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میری ولدیت کے خانے میں کس کا نام درج ہے۔ اہم بات تو میرا تولد ہونا ہے۔

ٹھیک کہتے ہیں آپ! یہ بھی کوئی اہم بات نہیں کہ مجھ جیسے تو لاکھوں اس جہاں میں روز پیدا ہوتے ہیں۔ خیر! میرا پیدا ہونا کوئی کارنامہ نہیں لیکن واقعہ تو ہے۔ اب یہ واقعہ کچھ یوں آگے بڑھتا ہے کہ جب میں نے ہوش سنبھالا۔

دیکھئے! اس جملے پر بھی آپ کے ہونٹ مسکرانے لگے ہیں۔ میں اس مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ رہا ہوں۔ سچ ہے اگر میرے جیسے ہوش سنبھالنے لگیں تو قیامت نہ آ جائے۔ اچھا تو اسے یوں کہا جائے کہ میں جب دیکھنے کے قابل ہوا تو پہلی نظر جس وجود پر پڑی، مجھے یقین ہے کہ وہ وجود میری ماں کا تھا۔ میرے اس یقین کی کوئی پختہ وجہ نہیں لیکن مجھ جیسے جانور کا دماغ بھی محسوس کر سکتا ہے کہ اتنی مہربان شخصیت صرف ماں کی ہی ہو سکتی ہے۔ موقع ملتے ہی وہ میرے جسم کو اپنی پیار اا اور ممتا بھری زبان سے چاٹ چاٹ کر گیلا کر دیتی اور مجھے احساس ہوتا کہ میرے وجود کی غلاظت اس نے اپنی زبان میں جذب کر کے مجھے پاک و صاف کر دیا ہو۔ میرا جی چاہتا کہ اس کی زبان کا لمس میرے جسم کو ہر وقت ملتا رہے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔

کیوں؟ ارے جناب! اب اس قدر انجان نہ بنئے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میری ماں بھی اور ماؤں کی طرح کسی کی خادمہ تھی اور اس کے وجود سے پھوٹنے والے چشمے پر اس کے مالک کا ادھیکار تھا۔ اگر میں ہی اس چشمے سے ہمہ وقت سیراب ہوتا رہتا تو اس کے پلے کیا پڑتا؟ اس

کا بس چلتا تو اس چشمے کی ایک بوند بھی مجھے نصیب نہ ہوتی۔ وہ تو میری ماں کے جذبے کی شدت تھی کہ ہر ظلم برداشت کرتے ہوئے بھی کوشش کرتی کہ میں بھی اس چشمے سے تھوڑا فیض یاب ہولوں۔

اگر آپ لوگ میری ماں کے کردار پر انگلی نہ اٹھانے کا وعدہ کریں تو ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ میرے لئے میری ماں چور بھی بن جاتی تھی۔ اپنے وجود سے پھوٹتے چشمے کے دوار بند کر کے اس میں چوری کا سامان بھر لیتی تھی۔

چور کس لئے؟ ارے جناب میرے پیٹ کیلئے، آپ لوگ اس طرح حیرت سے کیوں تک رہے ہیں؟ ہم جانور اگر کچھ چوری بھی کریں تو اسے رکھنے کیلئے ہمارے پاس پیٹ کے علاوہ اور کیا ہے؟

ابھی میں اس کی ممتا کی نہر سے پوری طرح سیراب بھی نہیں ہو پایا تھا کہ مجھے اس سے علاحدہ کر دیا گیا۔ اسی دوران مجھے ایک نا قابل برداشت عمل جراحی سے گزارا گیا اور اب میں پوری طرح مالک کی خدمت کرنے کیلئے تیار تھا۔ آہستہ آہستہ میری قوت کے مطابق مجھ سے چھوٹا موٹا کام لیا جانے لگا۔

پھر میں جوان ہو گیا۔ میں سوچ نہیں پا رہا ہوں کہ مجھے یہ لفظ استعمال کرنا چاہیئے یا نہیں کیونکہ جوان ہونے کے کی جو علامتیں میں نے دوسرے آوارہ جانوروں سے سن رکھی تھیں وہ تو مجھ میں ظاہر ہی نہیں ہوئیں۔ میرے سینے میں نہ جذبات مچلے نہ نظروں میں بجلیاں کوندیں، نہ نسوں میں تناؤ آیا اور نہ ہی رگ وپے میں ابلتے ہوئے خون کے شرارے لپکے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں نے لڑکپن سے سیدھا بڑھاپے میں قدم رکھا۔

لیکن نہیں! بوڑھا تو میں اب ہوا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ اس وقت میں سارا دن جی توڑ محنت کرتا تھا لیکن آج کی طرح نہ سانسیں پھولتی تھیں اور نہ ہی پٹھے سست پڑتے تھے۔

بھائی صاحب! ذرا آپ میری پشت کے زخم پر بھنبھناتی ہوئیں مکھیوں کو اڑانے کی تکلیف کریں گے؟ اگر میری دم درست اور صحت مند ہوتی تو آپ کو یہ تکلیف کرنے کی زحمت نہیں دیتا۔ لیکن میری دم کو تو اس قدر کھینچا گیا ہے کہ اس کی رگیں اپنی جڑ چھوڑ چکی ہیں اب جو شئے جڑ سے جڑی

ہی نہ ہوتو اس کے عدم اور وجود میں کیا فرق؟

کیا آپ یہ تکلیف نہیں کریں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ میرے پاس آنے کے سلسلے میں کچھ پس و پیش میں مبتلا ہیں۔ ارے بھائی! میں ایک بے ضرر جانور ہوں۔ مجھ سے بھلا کیسا خوف؟ خیر چھوڑیئے! ہر ایک کو اپنا زخم آپ ہی چاٹنا پڑتا ہے۔ اب اس زخم تک میری زبان نہیں پہنچ پا رہی ہے تو آپ کا کیا دوش؟

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میں جوان ہو گیا یا یوں کہہ لیں کہ طاقت ور ہو گیا۔ اب جوانی کے مفہوم سے تو میں نا آشنا ہوں لیکن طاقت کے معنی تو جانتا ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت آ گئی کہ میں اپنے مالک کے کھیت میں ہل جوتنے لگا اس کے کولہو میں تیل پیڑنے لگا اور اس کی سواری کی گاڑی کو کھینچنے لگا۔

اگر میرا مالک یہاں موجود ہوتا تو وہ تصدیق کرتا کہ میں نے کبھی کسی بھی کام میں آنا کانی نہیں کی۔ جو کام بھی مجھے سونپا گیا، میں نے اس کی تکمیل میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دیں۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ میرے مالک کو کسی شکایت کا موقع نہ ملے۔ برسوں میرے ذریعہ جوتے ہوئے کھیت میں اس نے لہلہاتی فصلیں اگائیں اس کے گھر میں سال بھر کا غلہ رکھ کر بقیہ کو میں ہی کھینچتا ہوا منڈی تک لے گیا۔ اپنے جسم کا خون پسینہ ایک کر کے سرسوں کے سخت بیجوں سے تیل نکالا جسے بیچ کر اس نے خوب روپے کمائے لیکن میں نے کبھی کوئی لالچ نہیں کی۔ وہی دو وقت کی گھاس پھوس سے میں مطمئن تھا اور زیادہ کی مجھے ضرورت بھی کیا تھی؟ مجھے کون سی دولت جمع کرنی تھی؟

لیکن سب دن ایک سے نہیں رہتے۔ آہستہ آہستہ میرے پٹھے کمزور ہوتے گئے، میری نظریں دھندلانے لگیں اور مجھ پر بڑھاپا حاوی ہونے لگا۔ اب قدرت کے نظام میں میرا کیا دخل؟ یہ تو عین فطرت کے مطابق ہے۔ لیکن برا ہو ان جدید ایجادات کا جن سے مسابقت کی کوشش میں میری کمزوریاں کچھ زیادہ ہی عیاں ہوتی گئیں۔

ہوا یوں کہ میرے مالک کے پاس کے کھیت کا مالک کھیت جوتنے کیلئے ٹریکٹر لے آیا اور اس کے پڑوسی نے تیل نکالنے کی مشین بٹھالی۔ اب بھلا ان مشینوں سے میرا کیا مقابلہ؟ لیکن پھر بھی

میں نے کوشش کی کہ ان مشینوں کو اپنے آپ پر بالادستی حاصل کرنے نہ دوں لیکن لعنت ہو میرے بوڑھے ہوتے ہوئے شریر پر جس نے ہر قدم پر میرا ساتھ چھوڑا۔

ویسے بھی ہر ایک کی اپنی حد ہوتی ہے اگر اس حد سے باہر جانے کی کوشش بھی کرے تو جائے کیوں کر؟ میں نے بھی کوشش کی لیکن لاحاصل، ان مشینوں کی تیز رفتار کارکردگی دیکھ کر میرا مالک مجھ پر اپنی کھنس نکالنے لگا۔ یہ جو میرے جسم پر ڈھیر سارے زخم نظر آرہے ہیں، جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں، سب اسی کی دین ہیں۔ وہ روز بروز میری خوراک کی مقدار گھٹاتا گیا۔ میں نے اُف نہیں کی۔ ان زیادتیوں کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر میں نے خندہ پیشانی سے قبول کرلیا۔ لیکن آج...... آج تو اس نے حد کردی۔

میں صبح نیند سے جاگا تو وہ ایک آدمی کے ساتھ میرے پاس کھڑا تھا۔ اس آدمی نے میرے جسم کو ٹٹول کر دیکھا اور پھر مایوسی سے سر ہلاتا ہوا میرے مالک سے کچھ بات کرنے لگا۔ مجھے لگا کہ وہ دونوں کسی لین دین کے معاملے پر الجھ رہے ہیں اور پھر کسی بات پر متفق ہو کر وہ آدمی میری رسی کھولنے لگا۔ تب میں نے جانا کہ مجھے قصائی کے ہاتھوں بیچ دیا گیا ہے۔ اپنی بے لوث غلامی کا یہ انعام پا کر میں شدت جذبات سے رو پڑا اور بے ساختہ اپنے مالک کو مخاطب کر کے کہا

''میری زندگی بھر کی خدمات کا یہی صلہ ہے''؟

میرا اتنا کہنا تھا کہ پتہ نہیں کیا ہوا؟ میرا مالک اور قصائی سر پر پیر رکھ کر بھاگ نکلے۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے بولتا دیکھ کر ہی وہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے ہیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگوں کے چہروں پر میرے لئے کسی ہمدردی کا عکس نہیں صرف استعجاب کی پرچھائیاں نقش ہیں۔ شاید آپ لوگوں پر بھی میری دکھ بھری سرگذشت کا کوئی اثر نہیں صرف میرے بول اٹھنے پر تعجب ہے۔ لیکن صاحبان! صرف زبان کھل جانے سے کیا ہوتا ہے؟ میں تو آج بھی چار پیروں سے چلنے والا وہی بے ضرر بیل ہوں۔ ہاں ہوسکتا ہے کہ ایسے ہی کسی انتہائی حد پر میری نسل کا کوئی جانور اضطراری حالت میں آپ کی طرح اپنے دو پیروں پر آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے''۔

☆☆☆☆☆

زخمی پرندہ اڑان پر

نقطۂ انجماد سے بھی ۱۰ ڈگری کم درجہ حرارت میں کارگل اور دراس سیکٹر کی بلند ترین برفیلی چوٹیاں آتش بار بنی ہوئی تھیں۔ ہندوستانی فوج کے تعمیر کردہ خالی بنکروں پر دشمنوں نے قبضہ جمالیا تھا جنہیں تحفظ فراہم کرنے اور ہندوستانی فوج کی پیش قدمی روکنے کیلئے سرحد پار سے مسلسل توپ کے گولے داغے جارہے تھے۔ان کے جواب میں ہندوستانی بوفورس بھی گرج رہی تھیں۔اس خوفناک گولہ باری کے باعث ان قصبوں کی مکمل آبادی کا انخلا ہو چکا تھا اور یہاں اب صرف فوجیوں کی نقل و حرکت ہی دکھائی دیتی تھی۔ابتدائی فرد گزاشتوں کے بعد فوج بے حد منظم اور موثر طریقے سے دشمن سے برسر پیکار تھی اور دشوار گزار خطرناک پہاڑیوں پر جان نثاری اور جانبازی کی سنہری تاریخ رقم کر رہی تھی۔

دراس سیکٹر کی پہاڑیوں کے نیچے ایک کشادہ غار میں موجود فوجیوں کو مخاطب کرتے ہوئے گیارہویں راجپوتانہ رائفلس کے میجر سریش سنگھ موہن کی بارعب آواز گونجی۔

''ہمارا ایک فوجی دستہ شام ڈھلتے ہی پوائنٹ ۴۳۰۰ کی چوٹی پر چڑھائی کرے گا۔اس دستے کی قیادت سیاچن جنگ کے تجربہ کار کیپٹن راکیش کمار کریں گے۔ان کے ہمراہ لفٹننٹ سجیت سنگھ، نائک کرشن یادو، لانس نائک مشتاق خان، رائفل مین سریندر سنگھ، سپاہی منوج کمار، سپاہی حیدر علی اور سپاہی ہربھجن سنگھ ہوں گے۔آپ لوگوں کو یہاں کے حالات کا بخوبی اندازہ ہے۔گرچہ دشمن جدید اسلحوں سے لیس ہم سے بہتر پوزیشن میں بلند چوٹیوں پر موجود ہے لیکن جنگ صرف بہتر پوزیشن اور بہتر اسلحوں سے نہیں جیتی جاسکتی۔جذبوں کی صداقت اور پرزور عوامی حمایت جنگ میں فیصلہ کن کردار ادا کرتی ہیں۔اور ہمیں یہ دونوں چیزیں حاصل ہیں۔ہمیں فخر ہوگا کہ ہم مادر وطن اور برادران وطن کی حفاظت کرتے ہوئے قربان ہو جائیں''۔

کیپٹین راکیش کمار کی شکوہ گزار آنکھوں میں ایک بے حس اور بے مہر چہرہ ابھرا۔ کانوں میں طنز و تضحیک میں ڈوبے قہقہے گونجے اور ایک بار پھر اس کی شریانوں میں ڈھیر ساری تلخی گھل گئی۔ اس کے اندر اپنے افسر کے کلمات کے خلاف نعرۂ احتجاج بلند ہوا۔ ''نو سر...... مجھے ان جیسے لوگوں کی حفاظت کر کے قطعی فخر نہیں ہوگا''۔

''کیپٹین راکیش''! میجر سریش سنگھ موہن جیسے اس کے وجود میں اٹھنے والے مدوجزر سے واقف ہوگیا۔ ''یس سر''۔ وہ فوجی تربیت کے زیر اثر نہایت سرعت سے اٹینشن ہوگیا۔

کیا تم کچھ بے سکونی محسوس کر رہے ہو؟'' میجر کی تیز چبھتی ہوئی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''نو سر! میں بالکل ٹھیک ہوں''۔ اس نے اپنے لہجے کو پر اعتماد بنانے کی حتی الامکان کوشش کی۔

''تم لوگوں کی ضروریات کا سارا سامان یہاں موجود ہے۔ جلد سے جلد تیار ہو کر آپریشن کیلئے پوائنٹ ۴۳۰۰ کی جانب کوچ کرو''۔

میجر کے حکم پر کیپٹین راکیش اور اس کے ساتھی فوجی ساز و سامان کے ذخیرے کی طرف بڑھے۔ گلشیر سوٹ کو ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کیپٹین راکیش کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ ابھر آئی۔ اسے شناخت کرنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی کہ یہ سوٹ سیاچن میں استعمال شدہ ان بوسیدہ پوشاکوں میں سے ہے جنہیں ردّی کے طور پر فروخت کرنے کیلئے محفوظ کر دیا گیا تھا۔ اسنو بوٹ بھی گھٹیا اور بے کار تھے۔ کئی بوٹوں کے نیچے تو وہ کیلیں بھی موجود نہیں تھیں جو چٹانوں پر پیروں کو پھسلنے سے روکتی ہیں۔ ایک گلشیر سوٹ جس میں پشت کا تھیلا، سیلپنگ بیگ، ٹنٹ اور اسنو بوٹ ہوتے ہیں تقریباً دو لاکھ روپے میں آتا ہے۔ فوج نے ان کے ساتھ دیگر آلات حرب کی فراہمی کیلئے بارہا سرکار سے درخواست کی تھی لیکن نوکر شاہی کے سفید ہاتھیوں میں گھری ہر سرکار نے اس سے چشم پوشی کی۔ دفاعی اخراجات میں بے تحاشہ کٹوتی کی وجہ سے فوج کو جدید ترین اسلحوں اور جنگی آلات سے لیس نہیں کیا جاسکا جس کا عبرتناک انجام سامنے تھا۔

انہوں نے گلشیر پوشاکوں کو زیب تن کیا۔ اسنو بوٹ پہنے، لائٹ مشین گن اور آئی این ایس اے ایس رائفل سے خود کو مسلح کیا اور غار سے نکل آئے۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور رات کسی عفریت کی طرح پہاڑ کی چوٹیوں سے اترتی ہوئی تمام وادی کو اپنے یخ بستہ سینے میں بھینچتی جارہی تھی ۔ دونوں سمت سے توپوں کی گولہ باری جاری تھی جن کی زد پر ہر وجود آتا جارہا تھا جس کی پیشانی پر فنا کی تحریر رقم ہو چکی تھی۔ پوائنٹ ۴۳۰۰ کی چوٹی کے نیچے پہنچ کر کیپٹین راکیش نے نہایت بے دلی سے محل وقوع کا جائزہ لیا۔ خط مستقیم کی طرح بالکل سیدھا کھڑا ہوا پہاڑ تھا جس پر چڑھنے کیلئے کوہ پیمائی کی گہری مہارت ضروری تھی۔ اس کی بہ نسبت سیاچن کے پہاڑ پر چڑھنا تو بے حد آسان تھا کیونکہ وہ ایسے سیدھے ایستادہ نہیں تھے۔ پھر وہاں تیرہ سے اٹھارہ ہزار فٹ بلند چوٹیوں پر پہنچنے کے لئے سڑکیں بنی ہوئی تھیں جن سے برف والی گاڑیاں آسانی سے گزر سکتی تھیں۔ لیکن کارگل اور دراس سیکٹر کی تقریباً بیس ہزار فٹ بلند پتھریلی دھاردار چوٹیوں پر پہنچنے کیلئے گہری تنگ گھاٹیوں سے گزرنا تھا جہاں ذراسی بے احتیاطی جسم سے روح کا رشتہ منقطع کر سکتی تھی۔ کیپٹن راکیش کے ذہن میں ایک بار پھر احتجاج کی شدید لہر اٹھی۔ اس خطرناک مہم پر جان جوکھم میں ڈالنے کا کیا جواز ہے؟ ان جیسے لوگوں کے تحفظ کیلئے خود کو ہلاکت میں کیوں ڈالا جائے؟

''سر! اوپر چڑھنے کے لئے وہ جگہ مناسب ہے''۔ اچانک لفٹنٹ سجیت سنگھ نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا تو وہ چونکا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے پیچھے موجود دوسرے ساتھیوں پر نگاہ ڈالی جو اس کے حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ بادل نخواستہ اس نے ہامی بھری اور آگے بڑھنے کو ہوا کہ لفٹنٹ سجیت سنگھ نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا۔ ''سر! اگر آپ اجازت دیں تو اس محاذ پر میں آپ کے آگے رہوں''۔

اس نے قدرے تعجب سے اس بیس بائیس سالہ نوجوان کو تکا جس کے چہرے کے دلکش نقوش تیرگی میں غیر واضح تھے۔ ''کیوں''؟

''میں آپ کو کور کروں گا سر!'' وہ پرجوش لہجے میں بولا تو اس نے ترحم آمیز نگاہیں اس کے سراپے پر ڈالیں۔ جب فوجی تربیت مکمل کر کے اس نے فوج میں کمیشن پایا تھا تو اس کی پہلی پوسٹنگ

سیا چن گلشیر میں ہوئی تھی۔اس وقت حب الوطنی کے جذبے سے سرشار وہ بھی اسی نوجوان کی طرح بے حد پر جوش تھا لیکن یہاں آنے سے قبل کے واقعے نے اسے نہایت دل برداشتہ کر دیا تھا۔حب الوطنی کا وہ شدید جذبہ بری طرح متزلزل ہو چکا تھا اور اب وہ وطن پر قربان ہونے والی کیفیت سے باہر نکل آیا تھا۔لفٹننٹ سجیت سنگھ کی پیشکش پر سانپ کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں لہرایا۔ اچھا ہے میرے بجائے دشمن کی گولیوں کا پہلا نشانہ یہی بیوقوف بنے اور اس نے اجازت دیدی۔ مضمحل اور بوجھل قدموں سے آگے بڑھتے ہوئے کیپٹن راکیش کے تصور میں وہ واقعہ ابھرا جس نے اس کی حب الوطنی کے جذبے پر کاری ضرب لگایا تھا۔

وہ مہینے بھر کی تعطیل میں اپنے گھر واپس آیا تھا۔عرصہ بعد بیوی بچوں کی معیت میں چند خوشگوار اور پرسکون دن گزر رہے تھے کہ چھٹیوں کی منسوخی کے ساتھ محاذ جنگ پر فوراً روانہ ہونے کا حکم نامہ آ گیا۔روانگی کیلئے فقط ایک روز کی مہلت دی گئی تھی۔وہ کسی قدر متفکر ہوا تھا۔چھوٹی بچی کی طبیعت ناساز تھی۔اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کا ارادہ تھا۔اس کے بیٹے ببلو نے پانچویں درجے کیلئے داخلے کا ٹسٹ دیا تھا جس کی لسٹ بھی آج ہی نکلنے والی تھی۔اس کی پریشانی کو محسوس کر کے اس کی بیوی آشا نے استفسار کیا۔اس کی روانگی سے متعلق جان کر اس کے چہرے پر کرب کے آثار پھیلے جنہیں بڑی سرعت سے چھپا کر وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی۔

''روانگی تو کل صبح ہوگی۔آج کا سارا دن پڑا ہے۔منی کو ڈاکٹر سے دکھا کر ببلو کی لسٹ بھی دیکھ لیں گے۔داخلے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں وہ میں دلا لوں گی''۔

اسے آشا کے حوصلے پر غم آمیز تفاخر کا احساس ہوا۔وہ کل ہی محاذ جنگ پر جانے والا تھا جہاں سے صحیح و سالم واپسی کی کوئی ضمانت نہیں تھی لیکن وہ کسی چٹان سی مضبوطی کے ساتھ ثابت قدم تھی ۔وہ آشا اور بچی کے ساتھ اسکوٹر پر سوار شہر کے چائلڈ اسپشلسٹ ڈاکٹر بی۔کمار کے مطب پہنچا۔ خلاف توقع مطب بند تھا۔دروازے پر ایک کاغذ چسپاں تھا جس میں پندرہ دنوں تک ڈاکٹر کے موجود نہ رہنے کی اطلاع درج تھی۔وہاں موجود ایک فرد نے ڈاکٹر کی غیر موجودگی کا سبب بتایا کہ وہ ورلڈ کپ کرکٹ دیکھنے انگلینڈ گئے ہوئے ہیں فائنل کے بعد ہی واپسی ہوگی۔صرف سطحی تفریح

حاصل کرنے کیلئے ایسے اہم اور ذمہ دار پیشے سے منسلک شخص کی اتنی طویل غیر حاضری...... اسے گہری کوفت ہوئی۔ اسی نے بتایا کہ کچھ ہی فاصلے پر ایک اور چائلڈ اسپشلسٹ ڈاکٹر پی۔ مکھرجی کا مطلب ہے۔ پتہ دریافت کر کے وہاں پہنچا تو کافی بھیڑ تھی۔ باہر تعنیات ملازم نے بے حد اصرار پر نام درج کیا۔ نمبر آنے کا وقت دریافت کرنے پر اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ ''دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے''۔

اتنی دیر تک وہاں منتظر رہنا ایک دقت طلب کام تھا۔ اس نے آشا سے مشورہ طلب کیا۔

''اگر تمہیں یہاں کوئی پریشانی نہ ہو تو میں بی۔ اے۔ وی اسکول چلا جاؤں۔ ببلو کا نام تو میرٹ لسٹ میں آ ہی چکا ہوگا۔ کنفرم ہو کر داخلہ فارم لیتا آؤں گا''۔

''مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آپ بے فکر ہو کر جائیے''۔ بچی کو سینے سے لپٹاتے ہوئے اس نے اطمینان سے کہا تو وہ اسکول کی جانب روانہ ہو گیا۔ سڑکوں پر حسب معمول چہل پہل تھی جسے دیکھ کر قطعی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ ملک تاریخ کی مشکل ترین جنگ میں مصروف ہے۔ اس کا اسکوٹر اسکول کی بلند عمارت کے پھاٹک میں داخل ہوا تو بارہ سے اوپر کا عمل ہو چکا تھا۔ اسکوٹر اسٹینڈ کر کے وہ نوٹس بورڈ کے قریب آیا۔ حسب توقع وہاں لسٹ چسپاں تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام تلاش کیا۔ لسٹ میں درج تمام ناموں کو پڑھ لینے کے بعد اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس میں ببلو کا نام موجود نہیں تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ تو بے حد ذہین اور محنتی لڑکا ہے۔ ٹسٹ میں بھی اس نے صدفی صد سوالات حل کئے تھے پھر وہ منتخب کیوں نہیں ہو سکا۔ یقینی بات تھی کہ اس کے ساتھ انصاف نہیں برتا گیا۔ وہ فطری طور پر نرم مزاج اور صلح جو قسم کا فرد تھا لیکن اسکول کے اس غلط اور غیر منصفانہ فیصلے کے خلاف اس کے اندر غم وغصہ کی ایک تیز لہر اٹھی۔ ہیڈ ماسٹر کا آفس تلاش کرتا ہوا وہ ایک دروازے پر رکا جس پر ڈی۔ این۔ سنگھ، ہیڈ ماسٹر کی تختی آویزاں تھی۔ دبیز پردہ ہٹا کر اس نے اندر جھانکا۔ سامنے ہی میز کے عقب مین ریوالونگ کرسی پر ڈی۔ این۔ سنگھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے صحت مند اور سرخ وسپید چہرے سے رعونت جھلک رہی تھی۔ سامنے والی کرسیوں پر تین اور افراد موجود تھے۔ اجازت پا کر وہ اندر داخل ہوا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ان تینوں نے جو شاید اساتذہ تھے، اس پر

مطلق توجہ نہیں دی۔ ان میں سے ایک نے پریشان کن لہجے میں ہیڈ ماسٹر سے استفسار کیا۔

''میری پے سلپ میں صرف گیارہ ہزار پانچ سو بیس روپئے درج ہیں۔ پورے دو سو روپئے کم، ایسا کیوں''؟

''آپ نے غور سے نہیں دیکھا''۔ ہیڈ ماسٹر کسی قدر برہمی سے بولا۔''دو سو روپئے جنگی فنڈ کیلئے کاٹے گئے ہیں''۔

''یہ بھکاری سرکار......''اس کے لہجے میں نفرت اور حقارت کا عنصر نمایاں طور پر ابھر آیا۔ ''ہر موقعے پر ہم ملازموں کو ہی لوٹنے پر تلی رہتی ہے۔ کبھی سیلاب تو کبھی طوفان......اور اب یہ سالی جنگ......جیسے سب کا ٹھیکہ ہم ہی نے اٹھا رکھا ہے۔ پورے دو سو روپئے حرام کے کاٹ لئے۔ یہ کوئی زبردستی ہے''؟

ہیڈ ماسٹر اس کی تلخ کلامی پر کسی طرح کا ردعمل ظاہر کئے بغیر اس سے مخاطب ہوا۔'' کہیئے۔ کیا بات ہے''؟ جنگ کی مد میں صرف دو سو روپئے کاٹے جانے پر اس استاد کے تحقیر آمیز کلمات سے وہ کافی بدمزگی کا شکار ہوا تھا لیکن اسے نظرانداز کرتے ہوئے اس نے نرمی سے کہا۔''میرے لڑکے کا نام میرٹ لسٹ میں نہیں ہے''۔

''کوالیفائی نہیں کر پایا ہوگا''۔ ہیڈ ماسٹر نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''لیکن وہ خاصا ذہین ہے اور اس نے ٹسٹ بھی بہت بہتر دیا تھا۔ یقینی طور پر اس کے سلسلے میں کوئی بھول ہوگئی ہے''۔

''بھول کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا''۔ اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔''پوری طرح چیک کر کے لسٹ فائنل کی گئی ہے۔ اگر آپ اپنے لڑکے کو یہاں داخل کرانے پر بضد ہیں تو ڈونیشن کے طور پر دس ہزار روپئے لگیں گے۔ تیار ہوں تو داخلہ ممکن ہے ورنہ کسی اور اسکول میں کوشش کریں''

اس نے حیران کن نگاہوں سے ہیڈ ماسٹر ڈی۔ این۔ سنگھ کی طرف دیکھا۔ کیسی بے شرمی اور بے غیرتی ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی شریانوں میں بہتا ہوا خون لاوا بن کر باہر نکلنے والا ہے ۔اس نے کمال ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنا تعارف دیا۔

''دیکھئے! میں ایک فوجی ہوں اور کل ہی محاذ جنگ پر جانے والا ہوں۔ میرے پاس وقت نہیں کہ اس سلسلے میں کسی دوسرے اسکول میں کوشش کروں اور نہ ہی میرے پاس رشوت میں دینے کیلئے اتنی بڑی رقم موجود ہے''۔

''رشوت کا نام کس نے لیا ہے۔ میں ڈونیشن کی بات کر رہا ہوں''۔ وہ یکا یک چراغ پا ہو گیا۔

''نام بدل دینے سے نوعیت نہیں بدل جاتی۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ تعلیمی اداروں جیسی مقدس جگہوں پر بھی اتنی آلودگی در آئی ہے''۔

''تو اس آلودگی میں اپنے بچے کو ڈالنے پر کیوں مصر ہیں۔ اسے بھی اپنی طرح فوج میں دھکیل دیجئے''۔ اس نے مضحکہ خیز اور ذلت آمیز لہجے میں کہا تو کیپٹن راکیش بری طرح مشتعل ہو کر کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ ہیڈ ماسٹر کے بے حس اور بے مہر چہرے کو تکتے ہوئے اسے لگا کہ وہ سیاچن گلشیر کے مورچے پر دشمن فوجی کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر دشمن کی گردن مروڑ دے۔ بڑی مشکل سے اپنے اشتعال پر قابو پاتا ہوا وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوا۔

''ہم فوجیوں کیلئے وطن کی حفاظت کرتے ہوئے جان قربان کر دینا قابل فخر فریضہ ہے۔ وطن سرحدوں میں محصور محض ایک جغرافیائی خطے کو نہیں کہا جاتا۔ وہاں رہنے والے بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ افسوس کہ آپ جیسے لوگوں کی حفاظت کر کے ہمیں قطعی فخر نہیں ہوگا''۔

وہ واپسی کیلئے دروازے کی سمت بڑھا تھا کہ وہاں موجود لوگوں میں سے کسی کی آواز ابھری۔'' سرکار اسی حفاظت کیلئے تو تنخواہ دیتی ہے۔ کوئی مفت میں تو کرتے نہیں''۔ اور پھر طنز و تضحیک میں ڈوبے ہوئے قہقہے پگھلے سیسے کی طرح کانوں میں داخل ہوئے۔ وہ بغیر مڑے ہوئے تیزی سے باہر نکلا چلا آیا۔ ان کے ریمارکس اور قہقہوں نے اسے برافروختہ کرنے کی بجائے بے حد آزردہ کر دیا تھا۔ کیسے بے حس اور مادیت پرست لوگ ہیں؟ مادر وطن پر قربان ہونے کے جذبے کو میزان زر میں تولتے ہیں۔ کیا وہ بھی ان کی طرح آرام دہ اور محفوظ ملازمت حاصل نہیں کر سکتا تھا؟ کیا یہ لفظوں کی جگالی کرنے والے لوگ چوگنی تنخواہ پر بھی سیاچن اور کارگل جیسی موت کی برفیلی

وادیوں میں دشمن سے نبرد آزما ہو سکتے ہیں؟ لعنت ہے ایسے لوگوں پر جن کی نگاہ میں ایثار و قربانی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ زر پرست اور خود غرض کرکٹ کھلاڑیوں کی پوجا کرنے والے لوگوں کے لبوں پر سرفروشان وطن کیلئے کوئی کلمہ تحسین تک نہیں۔ اس کے ذہن میں بگولے اٹھنے لگے۔ یہاں کس کی حفاظت کیلئے جان دی جائے؟ کم ظرف اور وطن فروش سیاستدانوں کے لئے یا ان کے مغرور اور عیاش لونڈوں کیلئے جو جگہ جگہ جیسیکا لال مرڈر جیسے جرم کا ارتکاب کرتے پھر رہے ہیں۔ بے ضمیر اور مفاد پرست سرمایہ داروں کیلئے یا شراب اور دولت کے نشے میں چور ان کی اولادوں کیلئے جو اپنی کاروں سے فٹ پاتھ کے غریبوں کو کچلتے پھر رہے ہیں۔ کس کی حفاظت کیلئے جان دی جائے؟

ذہنی طور پر بری طرح منتشر اور شکست خوردہ وہ ڈاکٹر کے مطب پہنچا تو آشا بچی کو دکھا چکی تھی۔ اس نے کہا۔

''ڈاکٹر نے چیک اپ کر کے دوائیں لکھ دی ہیں۔ چیسٹ ایکسرے کرانے کو کہا ہے۔ رپورٹ کے ساتھ پانچ روز بعد آنا ہوگا۔ ببلو کیلئے داخلہ فارم لے آئے؟

''نہیں! چلو اب گھر چلتے ہیں''۔ شوہر کے سنجیدہ چہرے اور لہجے کو محسوس کر کے وہ قدرے تشویش میں مبتلا ہوگئی لیکن مزید استفسار نہ کر کے بچی کے ساتھ اسکوٹر پہ بیٹھ گئی۔ گھر آنے کے بعد راکیش نے تفصیل بتائی تو اس کی آنکھوں میں بھی افسردگی کے بادل تیرے لیکن وہ اسے ہٹاتی ہوئی حوصلہ افزاء انداز میں بولی، محاذ پر جاتے وقت ایسی لایعنی باتوں سے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں دوسروں کے رویوں سے کیا لینا؟ آپ اپنے فرض کی راہ پر ثابت قدم رہیں۔ بس''۔

لیکن وہ رات اس نے بے حد اضطراب اور کشمکش میں گزاری۔ تمام رات ہیڈ ماسٹر ڈی۔ این۔ سنگھ کا بے حس اور بے مہر چہرہ اور بلند قہقہے اس کی نیند میں مخل ہوتے رہے۔ صبح اٹھا تو اس پر گہرا اضمحلال طاری تھا۔ آشا سفر کی تمام تیاریاں مکمل کر چکی تھی۔ اس نے بڑی مشکل اور بے دلی سے خود کو روانگی کیلئے تیار کیا۔ گھر کے در و دیوار اور بیوی بچوں پر الوداعی نگاہیں ڈال کر وہ روانہ ہوا تو اس کے پیروں میں وہ مخصوص استقامت موجود نہیں تھی جو جانباز اور باحوصلہ فوجیوں کی شناخت ہوتی ہے۔

پہاڑ پر چڑھتے ہوئے دو بے حد طویل اور صبر آزما شب و روز گزر چکے تھے۔ کیپٹن راکیش

اور اس کے ساتھی لفٹننٹ سجیت سنگھ کی رہنمائی میں گہری تنگ گھاٹیوں سے گزرتے ہوئے چوٹی کی سمت بڑھتے جارہے تھے۔ کہیں کہیں گھاٹیاں اتنی تنگ ملتی تھیں کہ ان سے گزرنا محال تھا۔ ویسی صورت میں لفٹننٹ سجیت سنگھ چیتے سی پھرتی اور چستی کے ساتھ نوکیلے دھاردار چٹانوں پر ہاتھ پاؤں جماتا ہوا بیس پچیس فٹ اوپر جاتا۔ کسی مضبوط چٹانی سطح پر لوہے کی کیل گاڑتا اور اس سے رسی باندھ کر نیچے لٹکا دیتا۔ اسی رسی کے سہارے ایک کر کے سبھی اوپر پہنچتے اور پھر تنگ گھاٹیوں کا سفر شروع ہو جاتا۔ پتہ نہیں کتنی بلندی سر ہوئی تھی لیکن تیسری رات نصف سے زائد گزر چکی تھی۔ ایک کشادہ جگہ دیکھ کر وہ لوگ ستانے کی غرض سے بیٹھ گئے۔ راستے کی دشواریوں سے زیادہ سرد موسم کی جان لیوا سختی نے انہیں بری طرح نڈھال کر دیا تھا۔ سب کے سب مہر بہ لب تھے جیسے قیامت خیز برفیلی ہواؤں نے ان کی آواز کو بھی منجمد کر دیا ہو۔ کافی دیر بعد لفٹننٹ سجیت سنگھ کیپٹن راکیش سے مخاطب ہوا۔

''میں آپ کا زبردست مداح ہوں سر...... سیاچن گلشیر میں آپ کی شجاعت کے کارنامے ہمارے بیچ کیلئے باعث فخر تھے''۔

''تمہیں کب کمیشن ملا''؟ اس کے دریافت کرنے پر وہ بولا۔

''اسی سال سر! اور پہلی پوسٹنگ ہی یہاں ہوئی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ سر مجھے آپ کی ماتحتی میں محاذ پر جانے کا موقع ملا۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ میں آپ ہی کے شہر کا رہنے والا ہوں''۔

''اچھا!'' کیپٹن راکیش تھوڑا متعجب ہوا۔

''حالانکہ میرے پتا جی فوج میں بھرتی ہونے کے سخت خلاف تھے۔ ان کی دانست میں مجھے اس سے بہتر ملازمت مل سکتی تھی۔ لیکن سر...... کیا مادر وطن کی حفاظت محض ملازمت ہے؟ جس مٹی میں میرا جنم ہوا، پرورش و پرداخت ہوئی۔ کیا اس کے تئیں میرا کچھ فرض نہیں بنتا ہے؟ کیا میں جان دے کر بھی اس مٹی کے قرض کو چکا سکتا ہوں؟

کیپٹن راکیش کو جواب دینے میں دقت سی ہوئی۔ کچھ روز قبل تک اپنے وطن کے تئیں وہ بھی اسی طرح کے جذبات رکھتا تھا لیکن اس وقت اس کی باتوں کی تائید کرنے میں اسے کچھ تامل

ہوا۔ کوئی جواب دینے کی بجائے اس نے سوال کر ڈالا۔

''تمہارے پتا جی کا کیا نام ہے''؟

''شاید آپ انہیں جانتے ہوں سر۔ وہ شہر کے مشہور اسکول بی۔ اے۔ وی کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ دینا ناتھ سنگھ''۔

''کیا؟!'' کیپٹن راکیش یک لخت حیرت سے گنگ سا ہو گیا۔ وہ گہری تاریکی میں لفٹننٹ سجیت سنگھ کے ہیولے کو دیر تک تکتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے وجود سے ابلتا ہوا تلخیوں کا چشمہ خشک ہونے لگا۔ ذہن پر طاری افسردگی اور بے زاری کی کیفیت زائل ہونے لگی اور ہڈی جما دینے والی ٹھنڈک میں بھی اس کے لہو میں شرارے دوڑنے لگے۔

یکا یک مشین گن کی تڑ تڑاہٹ گونجی اور ان سے کچھ ہی فاصلے پر موجود چٹانوں سے گولیوں کی بوچھاڑ ٹکرائی۔

''لگتا ہے دشمن نے حملہ کر دیا ہے''۔ لفٹننٹ سجیت سنگھ نہایت مستعدی سے اٹھا۔ شانے سے مشین گن اتار کر تیزی سے آگے بڑھنے کو ہوا کہ کیپٹین راکیش نے اسے پیچھے کی جانب کھینچ لیا۔

''نو ینگ مین! میں تمہارا افسر ہوں اور دشمن کے مقابل سب سے آگے رہنا میرا فرض ہے''۔

اس نے پر عزم لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر پوزیشن سنبھال لی.......................

☆☆☆☆☆

خواب دیکھنے والے

دھوپ کی تمازت اور غبار آلود فضا سے مضمحل اور بوجھل دن، شام کی اداس اجڑی ہوئی چوکھٹ پر رکا ہی تھا کہ وہ خواب دیکھنے والے شہر میں وارد ہوئے۔ موسم خزاں کسی عفریت کی طرح ہر شئے پر مسلط تھا۔ وہ اپنے روایتی اور مخصوص زرد رنگ کے منحوس پیرہن میں ملبوس تھا اور بین کرتے ہوئے ہر خاک بہ سر منظر پر فاتحانہ نگاہ ڈالتے ہوئے گہری آسودگی اور سفاکی سے مسکرا رہا تھا۔ بے آب و گیاہ زمین پر درختوں کے زخم خوردہ سلسلے تھے جن کی بے لباس شاخیں لشکر غنیم کے ہاتھوں لٹتی ہوئیں دوشیزاؤں کی طرح اپنی برہنگی چھپانے کی سعی لاحاصل میں مصروف تھیں اور حسرت زدہ نظروں سے قریب آتی ہوئی تیرگی کی منتظر تھیں کہ اس افتاد وقت میں اس کا سیاہ لبادہ ہی ان کا آخری پناہ گاہ تھا۔ زمین پر بکھرے ہوئے خشک پتے ہوا کے دست جبر و استبداد میں لرزہ براندام تھے اور ان کے لبوں پر گریہ و زاری تھی۔ شہر کا پورا ماحول اس طرح سہما ہوا اور ساکت و جامد تھا۔ جیسے ابھی ابھی ہر وجود کو روندتا ہوا کوئی طوفان ادھر سے گزرا ہو۔ ان خواب دیکھنے والوں کی آمد سے شہر کی خاموش فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ خواب دیکھنے والوں کا قافلہ پانچ افراد پر مشتمل تھا۔ ایک ضعیف العمر لیکن صحت مند باریش بزرگ جس کے چہرے کی بے شمار لکیروں سے واضح تھا کہ اس نے زمانے کے سرد و گرم خوب جھیلے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں تجربوں اور مشاہدوں کی گہری چمک تھی۔ دو بے حد خوبرو اور سنجیدہ نوجوان تھے جن کی روشن اور خوابیدہ آنکھوں میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ نقش تھی۔ ان کے ساتھ دو نرم و نازک خدوخال والے معصوم صورت بچے تھے۔ ہر چند کہ انہوں نے طویل مسافت طے کر کے شہر کی حدود میں قدم رکھا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر انکے چہروں سے کسی تکان کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس طرح تروتازہ تھے جیسے موسم بہار میں گل شگفتہ متبسم ہوں۔

انہوں نے شہر کے قلب میں واقع ویران باغ کے درمیان بنے چبوترے کو اپنا مسکن بنایا

اور چادریں بچھا کر دراز ہو گئے۔ شہر میں رات بھر ان لوگوں کے بارے میں قیاس آرائیاں ہوتی رہیں اور لوگ ان کے تعلق سے اپنے اپنے طور پر مختلف رائے قائم کرتے رہے۔ صبح ہوتے ہی بہت سارے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انہوں نے بے حد تعجب اور تجسس سے ان نو واردان شہر کو دیکھا جو ان کی موجودگی سے بے نیاز رات میں دیکھے گئے اپنے خوابوں کے تذکروں میں محو تھے۔ باریش بزرگ اپنی ٹھہری ہوئی پر اعتماد آواز میں گویا تھا۔

''میں نے دیکھا کہ مغرب کی سمت سے کالے گھنے بادل اٹھ رہے ہیں جو مکمل دنوں کی حاملہ عورت کی طرح بھاری قدموں سے شہر کی طرف رواں ہیں۔ ان کے قدموں کی آہٹیں سن کر درختوں کی زرد و نیم جاں شاخیں یکا یک جاگ پڑی ہیں اور ان کے استقبال کے لئے برگ نوزائیدہ سے سج گئی ہیں۔ زمین پر بکھرے ہوئے خشک پتے ان بادلوں کو تکتے ہوئے اس خیال سے آسودہ ہیں کہ انہیں نہیں تو نہ سہی، ان کی آئندہ نسلوں کو تو ایک خوشگوار اور باوقار حیات نصیب ہوگی''۔

ضعیف العمر شخص کے خاموش ہونے پر دونوں خوبرو نوجوان پر جوش انداز میں مخاطب ہوئے۔

''ہم لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بارشیں رحمت خداوندی کے پیکر میں زمیں پر اتر رہی ہیں۔ اس کے حیات افروز لمس سے ہر سو سرسبز منظر نمو پا رہا ہے۔ درختوں کی شاخیں برگ و بار سے لد گئی ہیں۔ زمین مدتوں کی تشنگی کو فراموش کر کے کامل سیرابی میں رقص کناں ہے اور موسم کی اس دلآویزی پر ہر بشر غنچہ تازہ کی طرح خنداں ہے''۔

دونوں معصوم بچوں نے خوابوں کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگوں کی صداقت کی قسم۔ ہم نے دیکھا کہ ہماری حد نگاہ تک زمین پر سبزہ زار پھیلا ہوا ہے اور اس پر قوس قزح کی رنگت والی تتلیاں محو پرواز ہیں۔ شاخوں پر خوشنما اور خوش الحان پرندے نغمہ سرا ہیں۔ پکے رسیلے پھلوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے ان پر وجد سی طاری ہے۔ بہت سارے پکے ہوئے پھل عطیہ غیب کی شکل میں سبز و نرم گھاس پر ٹپک پڑے ہیں جنہیں ہم رغبت سے کھا رہے ہیں''۔

دونوں بچوں نے اس طرح اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری جیسے وہ اب تک ان پھلوں کے ذائقے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

شہر کے افراد گہرے استعجاب سے ان کی عجیب اور ناقابل یقین باتیں سن رہے تھے۔ آخر ایک بوڑھے شخص سے رہا نہیں گیا۔ وہ آگے بڑھا اور قدرے تیز آواز میں ان سے مخاطب ہوا۔

تم لوگ کیسی تحیر آمیز اور مضحکہ خیز باتیں سنا رہے ہو؟ ہم لوگ عرصہ دراز سے خشک موسم کا عذاب جھیل رہے ہیں اور تم لوگ ہو کہ سرسبز مناظر کی آمد کی بشارت دے رہے ہو''۔

ان لوگوں نے چونک کر خوابیدہ نگاہوں سے بوڑھے شخص کی طرف دیکھا۔ باریش بزرگ نے گہری طمانیت کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم لوگ رات میں دیکھے گئے خوابوں کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ ہمارے ان خوابوں سے تم لوگوں کو کیا پریشانی لاحق ہو گئی''۔

''لیکن یہ خواب کیا ہیں''؟ ایک نوجوان نے رشک آمیز تاسف سے پوچھا تو بزرگ کے ہونٹوں پر پراسراری مسکراہٹ ابھر آئی۔

''خواب تو زندگی کے اساس ہیں۔ تبدیلی حالات میں خواب ہی موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ ناسازگار صورت حال میں ان کی رفاقت زندگی کو قدرے آسان بنا دیتی ہے''۔

''سنا ہے کہ تم لوگوں کو قانون و انصاف کے رکھوالوں نے اپنے شہر سے نکال باہر کیا ہے۔ کیا تم لوگ خطرناک مجرم ہو''؟ ایک مضمحل اور نحیف شخص کے استفسار پر باریش بزرگ نے اس کی بے نور آنکھوں میں جھانکا اور پھر گویا ہوا۔

''ہر شہر، ہر ملک میں بااثر اور برسر اقتدار افراد عام لوگوں کی آنکھوں سے تمام خواب چھین کر اپنے زیر تسلط کر لیتے ہیں اور پھر ان پر سخت پہرے بٹھا دیتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اپنا خواب حاصل کرنے کے لئے مزاحمت کرے تو قانون اور انصاف کی نظر میں وہ مجرم ہی قرار پاتا ہے۔ ہم لوگوں نے بھی مزاحمت کی اور اپنے خواب حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انجام کار ہمیں شہر بدر ہونا ہی تھا''۔

''تو کیا ہم لوگوں کے خواب بھی ہم سے چھین لیے گئے ہیں''؟ کسی فرد نے گہری افسردگی اور حسرت سے پوچھا۔

''اس کا اندازہ تو تمہیں خود ہی بخوبی ہوگا۔ کیا تمہاری آنکھیں بند ہونے پر کوئی خواب نہیں دیکھتیں''؟

''بند آنکھیں''۔ انہوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ ''لیکن ہماری آنکھیں تو سوتے وقت بھی کھلی رہتی ہیں''۔

اچانک دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی تیز آوازیں ابھرنے لگیں اور تمام لوگ خوفزدہ نگاہوں سے آوازوں کی سمت دیکھنے لگے۔ کچھ ہی توقف کے بعد اس شہر کے قانون وانصاف کے رکھوالے ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے وہاں موجود لوگوں کو گھورا اور پھر ان کی نگاہیں ان پانچوں نو واردانِ شہر پر مرکوز ہو گئیں۔

''کیا تم لوگ ہی خواب دیکھنے والے ہو''؟

''ہاں!'' باریش بزرگ نے جواب دیا تو ان میں سب سے قدآور گھڑسوار آگے بڑھا اور بے حد کرخت لہجے میں بولا۔

''تم لوگ یہاں کے شہری تو نہیں لگتے۔ کیا تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ یہاں خواب دیکھنے پر مکمل پابندی عائد ہے۔ خلاف ورزی کرنے والا سخت سزاؤں کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

''ہمیں اندازہ تھا کہ اس کرۂ ارض پر ہر جگہ یکساں صورت حال ہے اور ایک ہی طرح کا قانون نافذ ہے۔ لیکن خواب دیکھنا ہمارا پیدائشی حق ہے۔ ہم لوگوں کو اس حق سے کوئی محروم نہیں کر سکتا''۔

باریش بزرگ قدرے طیش میں بولا تو قدآور اسپ سوار نے اپنے شانے پر لٹکتی بندوق پر اپنے دائیں ہاتھ کی گرفت مضبوط کی اور اچانک اس کا کندہ باریش بزرگ کی پیشانی پر دے مارا۔ بزرگ تیورا کر زمین پر گر پڑا۔ اس نے اپنے گھوڑے کا رخ موڑا اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ان پانچوں کو گرفتار کر کے عقوبت خانے کی طرف لے چلو''۔

اس کے ساتھی گھوڑوں سے اترے اور سرعت سے ان کی مشکیں کسنے لگے اور پھر انہیں گھوڑوں کے پیچھے گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ شہر کے تمام لوگ کچھ خوفزدہ اور بے حد ناپسندیدہ نگاہوں سے ان کے جارحانہ حیوانی عمل کو دیکھتے رہے اور وہ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھنے والے گردوغبار میں گم ہوتے گئے اور ساتھ ہی ان پانچوں کی دلدوز چیخیں بھی معدوم ہوتی گئیں۔ فضا میں پسری ہوئی موسم خزاں کی اداسی اور بے رنگی کچھ اور واضح ہوتی گئیں۔ انہوں نے ان کے سرسبز خوابوں کو یاد کیا اور گہرے تاسف میں ہاتھوں کو ملتے ہوئے بوجھل اور پژمردہ قدموں سے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

لیکن اسی رات شہر میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ رات کے پچھلے پہر ایک بچے نے سرسبز منظروں کا خواب دیکھا اور صبح ہوتے ہی لوگوں کا ایک جم غفیر اس بچے کا خواب سننے کے لئے امڈ پڑا۔

☆☆☆☆☆☆

رام غلام کی واپسی

میں نے گھنے درختوں سے دھیرے دھیرے اترتی ہوئی شام کی آہٹ سنی تو بے حد ناامید ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ اندھیرا اپنے ٹھٹھرتے ہوئے وجود کو کچھ جلدی ہی شب کے قلمرو میں داخل کرانے کے لئے بے قرار تھا۔ مجھے اس لمحے پر غصہ آیا جب میں نے اس جنگل میں شکار کرنے کا ارادہ باندھا تھا۔ میں کوئی تجربہ کار اور ماہر شکاری نہیں تھا بس کچھ نٹھلے اور بے وقوف دوستوں کی ضد پر اس مصیبت کو گلے لگا بیٹھا تھا۔ ویسے دیکھا جائے تو یہ سارا کیا دھرا اس بندوق کا تھا جو برسوں پہلے دی گئی درخواست پر پچھلے دنوں ہی مجھے سونپی گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ لگے ہاتھوں اس کی آزمائش کر ڈالوں۔ کیا پتہ سرکاری دکان نے نقلی بندوق تھما دی ہو۔ اب گھنا جنگل ہو، شکار کا نیا نیا جنون ہو اور اناڑیوں کا ساتھ ہو تو راستے کا گم ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ ہوا یوں کہ ایک ہرن کا تعاقب کرتے ہوئے میں بہت دور نکل آیا۔ ہرن کی پشت کا نشانہ لے کر دو تین گولیاں بھی داغیں اور ہر بار بندوق کے تیز جھٹکے سے گرتے گرتے بچا۔ اچانک ہرن جانے کدھر گم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ راستہ بھٹک کر میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں۔ خدا ہی ملا نہ وصال صنم والی بات ہو گئی۔ واپسی کے لئے راستہ ڈھونڈے کی کوشش کرنے لگا تو جنگل میں بھٹکتے ہوئے اساطیری داستانوں کے جن شہزادوں پر ہنستا تھا ان پر بے حد ترس آنے لگا۔ جنگل تھا کہ شیطان کی آنت، ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ دن بھر جنگل میں امنگل کرتا رہا تھا اور اب رات ہونے والی تھی۔ سنا تھا کہ رات کی تاریکی میں ہی درندے اپنے شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ ہر چند کہ میرے پاس بندوق تھی لیکن اس پر مکمل طور سے اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک تو وہ تجربے میں کامیاب نہیں نکلی تھی، دوسرے اس بچ جانے والے ہرن کے سوا کوئی بھی میرے نشانے کی تعریف نہیں کر سکتا تھا۔ خیال آیا کہ جنگلی جانور آگ سے بہت ڈرتے ہیں اس لیے کیوں نہ آگ روشن کر لی جائے لیکن برا ہو بیوی اور ٹی۔ وی کا جنہوں نے سگریٹ چھڑا کر ہی دم لیا۔ اب بنا

سگریٹ کے ماچس رکھنے کا بھلا کیا جواز؟ تھک ہار کر ایک پیڑ پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ بلا سے سو نہیں سکتا تھا لیکن نیچے درندوں کو محنت سے بچانے کی بجائے خود کو بچانا ہی زیادہ مناسب تھا۔

درخت کی ایک موٹی شاخ پر لٹکے ہوئے چند ہی ثانیے گزرے ہوں گے کہ کچھ فاصلے پر آگ کے شعلے سے نظر آئے۔ لمحہ بھر کو خیال آیا کہ کیا جانوروں نے بھی آگ دریافت کر لی۔ لیکن فوراً اپنے اس احمقانہ خیال پر شرمندہ ہو گیا۔ آدمی اگر چاہے تو جانور بن سکتا ہے لیکن جانوروں سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ آدمی کی ہمسری کر لے۔ یقیناً آگ کسی آدمی نے ہی روشن کی ہوگی۔ کسی انسان کی موجودگی کے احساس نے مجھ میں کافی حوصلہ پیدا کیا۔ شہر ہوتا تو ان حالات میں کسی انسان کو پا کر میں یقینی طور پر خدشات سے بھر جاتا لیکن یہ جنگل تھا اور مجھے یقین تھا کہ جنگل میں ایک ہی نسل کے جاندار ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچائینگے۔

میں درخت سے نیچے اترا اور اندازے سے اس سمت بڑھنے لگا جدھر آگ کی روشنی دکھائی دی تھی۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے پر میں اس جگہ پہنچ گیا۔ میں نے تعجب سے دیکھا کہ سامنے درخت کی شاخوں اور جھاڑیوں سے تعمیر ایک کٹیا موجود ہے۔ اسی کے باہر خشک لکڑیاں جل رہی ہیں۔ کٹیا دیکھ کر اندازہ ہوا کہ کوئی یہاں مستقل طور پر قیام پذیر ہے اور یہ تعجب خیز امر تھا۔ میں نے کٹیا کے باہر کھڑے ہو کر آواز دی۔

''کوئی ہے''؟

دیر تک کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے آگے بڑھ کر جھاڑیوں سے بنے دروازے کو دھکا دیا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک موٹی سی شاخ نے میرے سر پر حملہ کیا۔ اگر میں سرعت سے خم نہ ہو گیا ہوتا تو میرا سر ٹکرے ٹکڑے ہو کر میرے ہی پیروں پر بکھرا پڑا ہوتا۔ تیزی سے پیچھے ہٹ کر میں نے بندوق تان لی۔ دروازے پر ایک عجیب وغریب جاندار کھڑا نظر آیا۔ اسے بڑے غور سے دیکھنے پر علم ہوا کہ وہ انسان ہی ہے۔ لیکن لگتا تھا کہ کسی آثار قدیمہ کی کھدائی میں نکلا ہے۔ وہ بہت ہی ضعیف اور ناتواں شخص تھا۔ سر اور داڑھی کے سفید بال اتنی بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے تھے کہ اس کی پوری صورت ہی چھپ گئی تھی صرف پھٹی ہوئی بے چین آنکھیں ہی دکھائی دے

رہی تھی۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا جسم برہنہ تھا بس کمرے کے نیچے کسی جانور کی کھال لپٹی ہوئی تھی۔

اپنی طرف تنی ہوئی بندوق کی نالی کو تاکتا ہوا وہ بکھری ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔

''تم مجھے زندہ نہیں لے جاسکتے''۔

اسے اپنی زبان بولتا سن کر میں قدرے متعجب ہوا۔ مجھے تو گمان گزرا تھا کہ کسی جنگلی پرانی سے پالا پڑا ہے۔ میں نے جھنجھلا کر کہا۔

''میں تمہیں زندہ تو کیا مردہ بھی نہیں لے جاسکتا۔ میں نے کوئی عجائب گھر نہیں کھول رکھا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ مجھ پر حملہ کیوں کیا؟''

''کیونکہ تم جنرل ڈائر کے آدمی ہو''۔ اس نے اتنے یقین کے ساتھ کہا کہ مجھے ہنسی آگئی۔

''میں تو صرف اپنی بیوی کا آدمی ہوں۔ ویسے یہ جنرل ڈائر کون ہے''؟

مشتبہ نگاہوں سے مجھے گھورتا ہوا اس نے بے اعتباری سے پوچھا۔

''تم جنرل ڈائر کو نہیں جانتے؟ تم کہاں کے رہنے والے ہو''؟

میں نے جگہ کا نام بتایا تو وہ تھوڑا اور چوکنا ہو کر چیخ سا پڑا۔ ''تم مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ کیا تم اپنے حکمراں سے بھی ناواقف ہو''؟

اس کے لہجے کی سختی اور پختگی سے حیرت زدہ میں سوچ میں ڈوب گیا۔ یک لخت مجھے کچھ یاد آیا۔ ''ہماری تاریخ کی کتابوں میں ایک ظالم اور بے رحم جنرل ڈائر کا ذکر ہے جو برسوں پہلے ہمارے علاقے کا حکمراں تھا۔ کہیں تم اسی جنرل ڈائر کی بات تو نہیں کر رہے ہو''؟

''ہاں! ہاں!! میں اسی ظالم کی بات کر رہا ہوں۔ کیا اب وہ حکمراں نہیں رہا''؟ اس کے لہجے میں گہرا اضطراب اور استعجاب تھا۔

''وہ تو غلامی کے دور کا ایک سیاہ باب تھا۔ ایک زمانہ گزر گیا ہے ملک کو آزاد ہوئے، اس کے ساتھ ہی ظلم و بربریت کا وہ بھیانک کردار بھی ختم ہو گیا۔ اب تو ملک میں جمہوریت ہے اور عوام کے ذریعہ منتخب فرد ملک کا حکمراں ہے''۔

''کیا سچ مچ ملک آزاد ہو گیا؟ جنرل ڈائر ختم ہو گیا''؟ وہ تذبذب کے عالم میں حیرانی سے

بڑبڑایا۔

''مدتیں گزر گئیں۔اب تو لوگ اس ظالم کو بھول بھی گئے۔لیکن جنرل ڈائر کا بھوت تم پر کیسے سوار ہو گیا''۔

کوئی جواب دینے کی بجائے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔گھنی داڑھی اور مونچھوں میں پوشیدہ اس کا چہرہ کپکپانے لگا اور آنسوؤں کی بوندیں پلکوں سے رس کر بالوں میں جذب ہونے لگیں۔اس کی یہ حالت دیکھ کر میں بھی تھوڑا سا آبدیدہ ہوا۔کچھ لمحوں کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔''تم نے ایک بڑی خوشی خبری سنائی۔شکر ہے کہ ہماری قربانیاں رائگاں نہیں گئیں۔اوپر والے کا کرم ہے کہ اس خبر کو سننے کے لیے میں زندہ رہا''۔

''لیکن تم کون ہو اور ان سب باتوں سے تمہارا کیا تعلق ہے''؟اس کی باتیں اب تک میری سمجھ سے پرے تھیں۔

''میرا تعلق مجاہدین آزادی کے اس گروہ سے ہے جس کے زیادہ تر افراد ظالم جنرل ڈائر کے ہاتھوں اپنے وطن پر قربان ہو گئے''۔

اس کا یہ انکشاف میرے تجسس میں اضافے کا باعث بنا۔واضح تھا کہ میں اتفاقاً ایک ایسے شخص سے جا ٹکرایا تھا جو تحریک آزادی میں براہ راست شامل اور متحرک تھا۔میں نے اس کی زندگی سے متعلق واقعات کی تفصیل سے واقفیت حاصل کرنی چاہی تو اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں مانو کھلی آنکھوں سے ماضی کی تاریک گپھا میں داخل ہونا ناممکن ہو۔

''میرا نام رام غلام ہے۔بچپن سے ہی غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم وستم مجھے مشتعل کرتے رہے تھے۔جب میں نے جوانی کی دہلیز پر پاؤں رکھا تو ملک کے زیادہ تر نوجوانوں کی طرح میرے خون میں بھی آزادی کا شدید جذبہ جوش پیدا کرنے لگا تھا۔میں مجاہدین آزادی کی اس جماعت میں شامل ہو گیا جو اس وقت سب سے فعال اور متحرک تھی۔اس جماعت کے حوصلوں اور قربانیوں سے غیر ملکی حکمراں پریشاں اور خوفزدہ تھے۔انہوں نے ہمیں ختم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی لیکن انہیں ہر بار شرمندہ ہونا پڑا۔ہم لوگ بڑی سرعت اور کامیابی کے ساتھ اپنے مقصد کے قریب ہوتے

جارہے تھے کہ جنرل ڈائر حکمراں بن کر آگیا۔ اس کی فطرت میں انصاف اور نرمی کا عکس تک نہیں تھا۔ وہ نسلی برتری کے زعم میں ہمارے برادران وطن کو کتوں سے بھی پست درجے کا جاندار تصور کرتا تھا اور ان سے ویسا ہی سلوک کرتا تھا۔ اس کی سفاکیت اور بربریت کا شکار ہو کر ہزاروں بے گناہ افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے باوجود اس کے ہمارا حوصلہ پست نہیں ہوا اور ہم دشمنوں کے خلاف برسرپیکار رہے۔

ایک رات ہم لوگ اپنے خفیہ ٹھکانے میں موجود تھے۔ ہماری ہی جماعت کے کسی غدار رکن کی مخبری پر جنرل ڈائر اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں آدھمکا۔ ہمیں چاروں طرف سے نرغے میں لے لیا گیا۔ وہ ٹھکانہ اتنے محفوظ مقام پر تھا کہ ایسے کسی واقعے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے ہم بری طرح چونکے۔ ہمارے سنبھلنے اور اسلحہ سنبھالنے سے پیشتر ہی ہمارے زیادہ تر افراد لقمہء اجل بن گئے۔ باقی بچی تعداد مقابل ہوئی لیکن ہم بری طرح گھر چکے تھے۔ دشمن بالکل محفوظ بلندی پر تھے اور ہمیں بآسانی اپنی بندوق کا نشانہ بنا رہے تھے۔ ایسی حالت میں فرار کا راستہ اپنانا ہی عقل مندی تھی لیکن وہ بھی ناممکن سا لگتا تھا کیونکہ تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ پھر بھی کچھ لوگ دشمن کے نرغے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ جن میں میں بھی شامل تھا۔ ہم لوگ قریب کے جنگل میں داخل ہو گئے۔ بچنا اب بھی مشکل تھا کہ دشمن ہمارے تعاقب میں تھے۔ ان کی بندوقیں موت اگل رہی تھیں۔ کتنے ہی افراد دوڑتے دوڑتے گرے اور انہیں دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ میں بھاگتا ہی رہا۔ نہ جانے کتنی لمبی دوڑ کے بعد مجھے پتہ چلا کہ میں اکیلا ہی بھاگ رہا ہوں۔ رات کے اندھیرے میں فاصلے کا اندازہ لگانا مشکل تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میں جنگل کے اندر بہت دور تک چلا آیا ہوں۔ ثانیے بھر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

"اگلی صبح سورج کی روشنی میں بھی میرے لیے صحیح راستے کی تلاش ناممکن سی تھی۔ میں نے اس جنگل سے نکلنے کے لیے بے طرح ہاتھ پاؤں مارے لیکن کامیابی نہیں ملی۔ بہت دنوں کی تگ و دو کے باوجود جنگل سے نکلنا نہیں ہوا تو بے بس ہو کر میں نے یہیں رہائش اختیار کر لی۔ سچ پوچھا جائے تو آہستہ آہستہ میرے بھیتر اس غلام ملک میں واپس جانے کی خواہش بھی دم توڑتی چلی گئی تھی کہ آج

تم یہ خوش خبری لے کر آ گئے''۔

اس کی کہانی بلا شبہ بے حد دلچسپ اور جذباتی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کی شخصیت برادران وطن کے لیے یقینی طور پر کشش کا محور ہو سکتی تھی۔ اس زمانے کے اور بھی نہ جانے کتنے اہم اور نا معلوم واقعات اس کی یادداشت میں محفوظ ہوں گے۔ جو بہت قیمتی اور تاریخی ہو سکتے ہیں۔ میرے تاجرانہ دماغ نے فوراً ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر جنگل سے نکلنے کی کوئی صورت نکلی تو اسے اپنے ہمراہ لے جاؤں گا۔ مجاہدین آزادی کو بالکل فراموش کر بیٹھے لوگوں کے لیے جنگل میں جانوروں کی طرح زندگی گزارنے والا مجاہد آزادی یقینی طور پر عجوبہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ظاہر تھا کہ اسے زبردست شہرت حاصل ہوتی جس کا ایک چھوٹا لیکن نمایاں حصہ مجھے بھی ملتا کیونکہ وہ میری ہی دریافت قرار پاتا۔

خوش قسمتی سے دوسرے دن ہی مجھے ڈھونڈتے ہوئے میرے ساتھی وہاں پہنچ گئے۔ میرے ساتھ اس عجیب الخلقت بوڑھے کو دیکھ کر انہوں نے تجسس ظاہر کیا لیکن میں نے انہیں خوبصورتی سے ٹال دیا۔ گھر پہنچنے کے بعد سب سے پہلا مسئلہ یہ پیش آیا کہ لوگوں میں رام غلام کو کس طرح متعارف کرایا جائے۔ مجھے احساس تھا کہ آج کے اشتہار زدہ زمانے میں لوگوں کا دھیان مرتکز کرنے کے لیے سب سے زیادہ اہمیت پیش کش کی ہے۔ بہت غور و فکر کے بعد میں نے فیصلہ کیا رام غلام کو اسی جنگلی ہیئت میں سب کے سامنے لایا جائے تا کہ اس کی اصلیت قائم رہے اور لوگوں میں کسی طرح کے شک کی گنجائش نہ رہے۔ میں نے میڈیا کے لوگوں کو مدعو کر اپنی اس انوکھی کھوج سے واقف کرایا اور جب رام غلام کو ان کے سامنے لایا گیا تو یک لخت ڈھیر ساری فلش لائیٹیں چمک اٹھیں۔ نامہ نگاروں نے اسے سوالوں کے گھیرے میں لے لیا۔ اس کے جواب سے تمام نامہ نگار بیحد مطمئن نظر آئے۔ یہی حالت میری بھی تھی۔ آخر اس دریافت کا سہرا میرے ہی سر بندھنا تھا۔

حسب توقع اگلے روز میڈیا والوں نے اس خبر کو خاص اہمیت دی۔ تصویر کے ساتھ اس کا مکمل تعارف بھی دیا گیا تھا جس میں خصوصی طور پر میرا بھی ذکر تھا۔ رام غلام کو مہذب جامہ پہنانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ تعلیم یافتہ شخص تھا اس لیے جلد ہی نئے ماحول میں گھل مل گیا۔ سر اور داڑھی کے سنورے ہوئے بال اور کھادی کے کرتے پاجامے میں اس کی شخصیت نکھر آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے

وہ بے حد مقبول ہوتا گیا۔ خصوصاً حکمراں جماعت کے افراد نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کے اعزاز میں جلسے منعقد کیے گئے۔ اس کی تعریف وتوصیف کے قصیدے پڑھے گئے۔ تحائف دیے گئے۔ مسلسل مل رہے اعزاز اور تحائف سے رام غلام بے حد متاثر اور مسرور تھا۔ خوش تو میں بھی تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ میری بھی پذیرائی ہوتی تھی۔

اور وہ پھر وقت آیا جب حصول آزادی کے لیے رام غلام کے بے لوث عملی تعاون کو حکومت نے جائز مقام دیتے ہوئے اس کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ عزت مآب جمہوری حکمراں نے رام غلام کو اعلیٰ ترین سرکاری اعزاز سے نوازنے کا اعلان کیا۔ اعلان کے مطابق یہ اعزاز یوم آزادی کی تقریب میں ان کے ہاتھوں ہی دیا جانا تھا۔ رام غلام کے ساتھ مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی جس سے میں بے حد خوش تھا۔ برسر اقتدار اور با اثر لوگوں کی قربت کے کتنے فائدے ہیں اس کا اب تک اچھا خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔

ہم دونوں بے صبری سے یوم آزادی کا انتظار کرنے لگے۔ مگر دونوں کے انتظار کی کیفیت میں بے حد تضاد تھا۔ میرے لیے یوم آزادی کوئی خاص کشش نہیں رکھتا تھا۔ کیا تھا اس دن میں؟ سرکاری تعطیل والے بہت سارے دنوں کی طرح ایک عام سا روکھا پھیکا دن۔ اس سے تو کہیں بہتر اور رنگین سال نو کی رات ہوتی ہے۔ ناچ گانے، ہنگامے اور مستی کی پوری آزادی۔ دراصل میں تو اس دن ہونے والی تقریب کا انتظار کر رہا تھا جس میں ہم دونوں پوری قوم کی نگاہوں کا مرکز بننے والے تھے جبکہ رام غلام یوم آزادی کی تقریب کی بجائے اس دن کا منتظر تھا۔ وہ دن جو اس کی نظر میں مقدس ترین تھا۔ جس کی آرزو میں آزادی کے دیوانوں نے پروانوں کی طرح اپنی جانوں کی قربانی دی تھی۔ اسی دن کے سپنے دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنی روشن اور زندہ آنکھیں رات ہونے سے پہلے ہی مند چکی تھیں۔ وہ اہم ترین دن جس کی صرف صبح پر ہی وہ اپنی پوری زندگی نچھاور کر سکتا تھا۔ وہ اس دن کے ہر ایک لمحے کی آہٹ کو اپنی روح میں پیوست کرتا ہوا سجدہ ریز ہونا چاہتا تھا۔ اس کے شفق کی سرخی خود میں سمیٹ کر اپنی تشنگی کو سیراب کرنا چاہتا تھا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا۔

مقررہ وقت پر تقریب شروع ہوئی۔ حکمراں نے بڑی تعداد میں موجود سامعین کو مخاطب

کرتے ہوئے رام غلام کی واپسی کو ملک کے لیے بے حد مبارک بتایا اور کہا کہ اس کی قربانی انمول ہے۔ اس جیسے لوگوں کی جدو جہد سے ہی ملک ظالموں کی غلامی سے آزاد ہوا اور اب یہاں عوام کے ذریعہ منتخب جمہوری حکومت قائم ہے۔ تقریر کے فوراً بعد رام غلام سے مودبانہ گزارش کی گئی کہ وہ قریب آئے تا کہ اس کی عزت افزائی کی جاسکے۔ رام غلام سحر زدہ سا لرزتے قدموں سے حکمراں کے قریب پہنچا۔ حکمراں نے جھک کر اس کے پاؤں چھونے کی کوشش کی تو اس نے ان کا شانہ تھام لیا اور انہیں اپنے سینے سے لگایا۔ جب وہ الگ ہوئے تو رام غلام کی آنکھیں شدت جذبات سے بھیگ چکی تھیں۔ وہ گہری محبت اور اپنے پن سے حکمراں کے باوقار چہرے اور چمکدار آنکھوں کو تکنے لگا۔ یک لخت وہ بری طرح چونکا اور ہڑ بڑا کر کئی قدم پیچھے کھسک گیا۔ حکمراں کی آنکھوں میں حیرت کے سائے لہرائے اور رام غلام جیسے سپنے میں بڑ بڑایا۔

''تم!......تم تو وہی ہو!...... بالکل وہی......!

''کیا مطلب''؟......وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں بولے''۔

''تمہاری یہ آنکھیں......میں ان آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتا......کبھی نہیں......!''

رام غلام پر جیسے وحشت سوار ہوگئی۔ وہ پاگلوں کی طرح حکمراں کی طرف بڑھا۔ کسی خطرے کا اندازہ کر کے وہاں موجود محافظوں کے پستولوں سے یک مشت گولیاں نکلیں اور اس کے بوڑھے ناتواں جسم میں دھنستی چلی گئی۔ اس کے باوجود اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ حکمراں کے چہرے پر جم گئے۔ اپنی سخت انگلیوں سے ان کا چہرہ ادھیڑتے ہوئے جب رام غلام بے جان ہو کر نیچے گرا تو دوسرے لوگوں کی طرح میں نے بھی گہرے تعجب سے جمہوری حکمراں کے مسخ شدہ چہرے کو دیکھا۔

وہ چہرہ تاریخی کتابوں میں چھپی جنرل ڈائر کی تصویر سے ہو بہو ملتا تھا۔

☆☆☆☆☆

میرے بیٹے کا قرض معاف کردو

آخر کار وہ حادثہ ہو ہی گیا جس سے صدیق عالم نے ہمیشہ دامن بچانے کی کوشش کی تھی۔ اب تک وہ حالات کی جس ڈور کو اپنے کانپتے ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھا، یک لخت وہ ڈور چھوٹ گئی تھی اور وہ خالی ہاتھوں حیران ساحیات کی سنسان شاہراہ کو تک رہا تھا۔ اسکے تمام احتیاط کے باوجود حالات ایسا رُخ اختیار کر گئے جس کے انجام پر یہ اندوہناک حادثہ رونما ہوا۔

اس نے اپنی پچاس سالہ زندگی اسی محلہ شاہ جہانی میں گذاری تھی۔ محلہ شاہ جہانی شروع ہی سے شہر کا کافی پچھڑا ہوا جرائم پیشہ علاقہ تھا۔ چھوٹے بڑے جرائم سے وابستہ بیشتر لوگ اس علاقے میں رہائش پذیر تھے لیکن ایسے حالات تو پہلے کبھی نہیں رہے۔ اسے یاد تھا کہ بچپن سے لے کر اس کی جوانی تک ان جرائم پیشہ افراد اور اس علاقے میں رہنے والے دوسرے نچلے اور متوسط طبقے کے افراد کے درمیان ایک گہرا فاصلہ برقرار تھا۔ سماجی آئینے میں یہ بدنما داغ موجود تو تھا مگر اس قدر بڑھا ہوا نہ تھا کہ انسانوں کے صحیح خدوخال واضح نہ ہو سکے۔ سماج کے سینے میں یہ ناسور موجود تو تھا لیکن اس قدر پھیلا نہ تھا کہ تمام وجود ہی زخم زخم ہو جائے۔ ان دنوں مجرموں میں اپنے جرائم کا احساس باقی تھا جس کی وجہ کر وہ لوگ دوسروں سے کٹے کٹے اور شرمندہ سے رہتے۔ جو بھی جرم ہوتا رات کی تاریکی میں ہوتا اور صبح ہوتے ہی اس کا نشان بھی باقی نہ رہتا۔ پولیس چاق و چوبند تھی اور لوگوں میں قانون کا خوف اور احترام بھی برقرار تھا۔ پولیس شریف لوگوں کی شکایت پر مکمل توجہ دیتی اور مجرموں کو کیفر کردار تک پہونچا کر ہی دم لیتی۔ رشوت اور رسوخ کا اس قدر بول بالا نہ تھا اور نہ ہی پولیس مجرم کی پشت بنا ہی کرتی تھی۔

وہ بچپن ہی سے محتاط اور امن پسند طبیعت کا مالک تھا۔ نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور اسے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر اپنے کاندھے پر پورے خاندان کی ذمہ داری اٹھانی پڑی۔ وقت سے قبل ہی پڑنے والے اس بوجھ سے اس کی کمر دوہری ہوگئی اور وہ روز

بروز سنجیدہ اور تنہائی پسند ہوتا گیا۔ باپ کی بے وقت موت نے اس کے اندر عدم تحفظ کے احساس کو جگا دیا تھا اور وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے لاتعلق ہو کر راہ حیات پر ایک ایک قدم نہایت احتیاط اور ثابت قدمی سے رکھ رہا تھا۔ زندگی کی گاڑی یونہی گھسٹتی رہی کہ اسی دوران اسے ایک اچھی سی سرکاری ملازمت مل گئی اور اسے احساس ہوا کہ زندگی اتنی مشکل بھی نہیں جتنی وہ تصور کر بیٹھا تھا۔

دونوں بہنوں کی شادی کر دینے کے بعد زندگی کو قدرے فراغت نصیب ہوئی تو سینے میں گھٹ کر سوئے ادھورے ارمان اور خواب از سر نو بیدار ہو گئے۔ اس نے دوستوں کا دائرہ وسیع کیا اور اتنے دنوں تک اپنے آپ کو جس سماج سے کاٹ بیٹھا تھا اس میں پھر سے جڑنے کی کوشش کی لیکن یہ محسوس کر کے اسے حیرت ہوئی کہ ان آٹھ دس سالوں میں ہی علاقے کے لوگوں میں بہت ساری تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کے دل و دماغ شر کی مزاحمت میں کمزور پڑتے جا رہے تھے اب وہ ڈھکے چھپے لہجوں میں قانون شکنوں اور سماج دشمن عناصر کی حوصلہ افزائی کرنے لگے تھے۔ اب مجرموں سے میل جول اور تعلق رکھنے کو بُرائی نہیں تصور کیا جاتا بلکہ کوئی کوئی تو فخریہ ان سے اپنی نسبت ظاہر کرتا۔ وقت بے وقت ان سے مالی اور شخصی تعاون لیا جانے لگا۔ آہستہ آہستہ مجرم سماج میں اہم اور باعزت مقام حاصل کرتے جا رہے تھے اور ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ایسے حالات دیکھ کر اس نے سماج سے دوبارہ کنارہ کشی اختیار کر لی اور شادی کر کے ایک مطمئن اور پُرسکون زندگی گذارنے لگا۔ اس کی بیوی زبیدہ ایک پُرخلوص اور نیک سیرت شریک حیات ثابت ہوئی تھی۔ دو سال بعد پرویز پیدا ہوا تو اس نے اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز کر دی۔ وہ اس کی اچھی سے اچھی پرورش کرنا چاہتا تھا۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلا کر اعلیٰ افسر بنانا چاہتا تھا تا کہ اس کے ادھورے خواب اپنے بیٹے کے توسط سے پایہ تکمیل کو پہونچے۔ لیکن ایک خوف بھی دامن گیر تھا کہ اس علاقے کے ماحول پر جس قدر کثافت اور گندگی چھا گئی تھی کہیں اس میں اس کے خواب بھی گرد آلود نہ ہو جائیں۔ اس نے اپنے بیٹے کو اس ماحول کی غلاظت سے بچانے کی حتی المقدور کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔ پرویز کا تعلیمی کیریئر تشفی بخش تھا اور اس کے اچھے کردار و اخلاق کے بھی سبھی گرویدہ تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سارا وقت گذرا۔ اب پرویز بی اے فائنل ایئر کا طالب علم

تھا۔ وہ اس کی بہتر کارکردگی پر بے حد مطمئن اور خوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ریٹائر ہونے تک وہ اپنے لئے کوئی بہتر اور کامیاب راہ نکال لے گا۔ اس کی سبکدوشی کے دن ہی کتنے بچے تھے، صرف تین سال۔ لیکن اسے پوری امید تھی کہ اسی دوران اسے اپنے مقصد میں کامیابی مل جائے گی، زندگی اسی امید و بیم میں گذر رہی تھی کہ اچانک یہ سانحہ پیش آ گیا، جس کا پس منظر تو اسی دن تیار ہو گیا تھا۔

حسب معمول وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر واپس ہو رہا تھا کہ کسی کے آواز دینے پر رک سا گیا۔ اس نے دیکھا کہ گلی کے ایک سرے پر علاقے کا غنڈہ رحمو اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ کھڑا اسے اپنی جانب بلا رہا ہے۔ اسے حیرت سی ہوئی اور دل کسی انجانے خوف سے کانپ اٹھا۔ اس نے تو کبھی ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھا اور نہ ہی کبھی دعا سلام کی نوبت آئی۔ پھر یہ بلاوا کیسا؟ وہ دھڑکتے دل سے ان کے قریب جا پہونچا۔

''تمہارا ہی نام صدیق عالم ہے''؟ رحمو نے گونجیلی آواز میں پوچھا تو اس نے زبان کھولے بغیر سر کو تائید میں ہلایا۔

''پرویز تمہارا ہی لڑکا ہے''؟

''جی! جی ہاں!!'' پرویز کا نام سُن کر اس کے سر میں دھماکہ سا ہوا اور اس نے تیزی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا اسے''؟

''ہوا تو نہیں لیکن ہو جائے گا! تم اسے سمجھاؤ ورنہ ہم اپنے طریقے سے سمجھا دیں گے''۔ وہ اپنے ہونٹ کے کنارے کو کاٹتے ہوئے بولا۔

''کیوں؟ کیا کیا ہے اس نے''؟

''اس سے کہہ دینا کہ ہمارے کاموں میں روڑے نہ اٹکائے نہیں تو ہم روڑا ہٹانا بھی جانتے ہیں۔ اور یہ آخری وارننگ ہے آئندہ ہم تمہیں کچھ کہنے نہیں آئیں گے''۔ وہ رعونت سے مڑا اور چل دیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کے ساتھی بھی چل پڑے۔ وہ آواک حیرت زدہ سا کھڑا رہ گیا۔

گھر میں داخل ہوتے وقت ذہنی الجھنیں عروج پر تھیں آخر پرویز نے ایسا کیا کیا ہے جو

رحمو اس قدر چراغ پا ہے۔ وہ رحمو کو اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے بارے کافی سُنا بھی تھا۔ علاقے پر آج کل اسی کی حکومت تھی، شراب کی بھٹی، جوئے کے اڈے، اسی کے دم سے قائم تھے۔ ڈھیر سارے قتل اور ڈاکہ زنی میں اس کا نام ماخوذ تھا۔ علاقے کے تمام لوگ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ پولیس اور قانون اس کی مٹھی میں تھے، اور اسے سیاسی لیڈروں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔

گھر میں صرف زبیدہ موجود تھی۔ پرویز کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس نے زبیدہ سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

''ابھی ابھی تو تھا، یہیں کسی دوست کے پاس گیا ہوگا''۔

''آج کوئی بات ہوئی تھی کیا''؟

''کیسی بات؟ زبیدہ سرسری طور پر بولی تو اسے یقین ہوگیا کہ اسے کچھ معلوم نہیں ورنہ وہ تو اس سے زیادہ پریشان ہوتی۔

''کچھ نہیں! یونہی محلے میں کچھ سُنا تھا''۔ اس نے اسے کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا اور پرویز کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ قریب آدھے گھنٹے کے بعد پرویز گھر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے کسی غیر متوقع ردعمل کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔ تجسّس اور خوف کے ملے جلے جذبات دل میں لئے ہوئے اس نے اسے اپنے قریب بلایا۔

''جی ابو!'' وہ شائستگی سے بولا۔

''رحمو سے تمہارا کیسا تنازعہ ہے''۔

''کون رحمو؟ وہ معصومیت سے بولا۔

''رحمو! اپنے علاقے کا غنڈا۔ اسے تم سے کیسی پرخاش ہے''؟

''وہ رحمو! اس سے تو میری کبھی کوئی بات چیت بھی نہیں پھر پرخاش کیسی''؟ وہ قدرے حیرت سے بولا۔

''پھر تم پر وہ اس قدر مشتعل کیوں ہے کہ مجھے دھمکی دے کر گیا ہے''۔

''دھمکی! آپ کو!! کس سلسلے میں؟ کیا کہا تھا اس نے''؟

''اس نے کہا کہ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ کہ اپنی حرکتوں سے باز رہے ورنہ انجام برا ہوگا۔ تم ان دنوں کیا کر رہے ہو''؟

''اوہ اب سمجھا!!'' اس نے طویل سانس لی۔ ''میں آج کل سماج سدھار کی تحریک چلا رہا ہوں۔ لوگوں کو شراب اور جوئے جیسی برائیوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کی ترغیب دے رہا ہوں۔ شاید یہی کام اسے پسند نہیں''۔

''لیکن کیوں؟ تمہیں ان فضول کاموں سے کیا مطلب''؟ وہ کچھ غصے میں بولا۔ ''تمہیں صرف اپنی تعلیم اور اپنے مستقبل کی فکر ہونی چاہئے۔ ان خرافات میں پڑنے کی کیا ضرورت''؟

''کیوں؟ کیا میں اس سماج کا ایک حصہ نہیں ہوں؟ کیا میں نے اس مٹی پر جنم نہیں لیا ہے؟ کیا مجھ پر سماج کا فرض اور مٹی کا قرض نہیں ہے؟ کیا میری اخلاقی اور ملی ذمہ داری نہیں ہے کہ اپنے قرب وجوار میں پھیلی ہوئی گندگیوں کو صاف کرنے کی کوشش کروں''۔

''لیکن بیٹے!'' وہ زچ ہوکر بولا۔ ''تم رحمو کو نہیں جانتے۔ تم جو یہ سب کچھ کر رہے ہو اس سے براہ راست اسی کے مفاد پر ضرب پڑتی ہے۔ اس علاقے میں جتنے بھی جوئے کے اڈے اور شراب کی بھٹیاں ہیں ان سب کا وہی مالک ہے اور وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ اس کے ناجائز دھندے میں کوئی رکاوٹ بنے۔ وہ خطرناک آدمی ہے اس سے دشمنی مول لینا عقل مندی نہیں''۔

لیکن کیا ان گندگیوں کو صرف اس لئے بڑھنے اور پھیلنے دیا جائے کہ ان کی کھاد سے کسی کی دولت کی زمین زرخیز ہوتی ہے؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ ان برائیوں کے جراثیم نے سماج کے جسم کو کس قدر کھوکھلا کر دیا ہے''؟

''میں جانتا ہوں''۔ صدیق عالم کو اس کی کٹ حجتی پر غصہ آنے لگا۔ اس نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے ان کاموں سے کسی کی بھلائی نہیں ہونے والی بلکہ صرف تمہیں نقصان پہونچے گا۔ میں نے تم سے زیادہ عرصہ اس علاقے میں گذارا ہے۔ یہاں کے ہر نشیب وفراز سے واقف ہوں۔ میں نے جرائم کے پودے کو بتدریج تناور درخت بنتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے برائیوں کی کہر آلود فضا کو آہستہ آہستہ مکمل علاقے پر اپنی گرفت مضبوط

کرتے ہوئے دیکھا ہے اور آج ہم ایسے وقت میں جی رہے ہیں جس میں بدی کو نیکی پر مکمل بالادستی حاصل ہے۔ آج ہماری سماجی اور ثقافتی زندگی میں ان لوگوں کی مکمل اجارہ داری ہے جنہیں مجرم کہتے ہوئے ہماری زبان لڑکھڑاتی ہے۔ آج یہی لوگ منصف اور مسیحا بن گئے ہیں جن کی مخالفت ایک خلقت کو تمہارے خلاف کردے گی۔ وہ لوگ جو ان کی ذات سے فیض یاب ہو رہے ہیں کبھی نہیں چاہیں گے کہ ان کے قدم اکھڑیں۔ آج ان کی جڑیں اتنی گہرائی میں پیوست ہیں کہ انہیں اکھاڑنے کی کوشش میں سانسیں اکھڑ سکتی ہیں۔ سماج کے ہر شعبۂ حیات پر ان کا قبضہ ہے۔ تم کہاں کہاں ان کے نقوش تلاش کر کے انہیں مٹانے کی کوشش کرتے رہو گے۔ اور پھر تمہیں ان اندھیری گلیوں میں بھٹکنے سے کیا حاصل؟ تمہارے سامنے ایک روشن اور تابناک مستقبل ہے جس کی جانب بڑھتے رہنا تمہارا فرض اولین ہے۔ تمہیں شاید احساس نہیں کہ تمہیں اس مقام تک پہونچانے میں کتنی محنت اور ریاضت میں نے کی ہے۔ تمہیں ان گندگیوں سے بچانے کے لئے کتنی احتیاط برتی ہے۔ زندگی کی راہوں میں ہر قدم دیکھ بھال کر صاف ستھری زمین پر رکھا۔ غلاظت کے ڈھیر میں کنول کھلانے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوا۔ تمہاری بہتر پرورش و پرداخت کے لئے میں نے تمہارے ساتھ خود کو ایک خول میں سمیٹ لیا۔ باہر کے گرد و غبار کی فکر چھوڑ کر اپنے ہی گھر کو صاف رکھنے کی پوری کوشش کی۔ مجھے فخر ہے کہ میری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ اس سماج کی غلاظت کا کوئی بھی نشان تمہارے دامن پر نہیں۔ تمہارے قدم اس دلدل تک کبھی نہیں پہونچے جس میں آہستہ آہستہ پورا معاشرہ غرق ہو رہا ہے۔ تم اس آب و ہوا میں سانس لینے والے دوسرے لوگوں سے الگ ہو۔ بالکل الگ!!''

''نہیں ابو! پرویز انکار میں سر ہلاتے ہوئے پرزور لہجے میں بولا۔'' میں خود کو ان لوگوں سے الگ نہیں سمجھتا۔ الگ ہو بھی نہیں ہو سکتا کہ ماحول کے اثر سے مفر ممکن نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اثرات مجھ پر منفی اثر نہیں ڈال سکے۔ میں نے ان کے منفی عمل میں شرکت نہیں کی لیکن ان سے اپنا رشتہ تو منقطع نہیں کر سکتا۔ وہ رشتہ جو اسی غلیظ مٹی سے جڑا ہے۔ وہ رشتہ جو اسی سڑے گلے سماج کے وجود سے قائم ہے۔ ہم سب اسی مٹی کے کن کن سے تشکیل پائے ہوئے ایک مکمل جسم کی مانند ہے

جس کے ایک حصے کو چوٹ پہونچے تو دوسرا بے حس نہیں رہ سکتا۔ ایک انگ سڑ جائے تو دوسرا انگ اس سڑن سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ جسم کے کسی حصے کو متاثر ہونے میں کچھ دیر ہو، لیکن متاثر تو ہوگا ہی۔ آج جبکہ میں باشعور ہو چکا ہوں اور معاشرے کا قریب سے جائزہ لیا ہے تو محسوس ہوا کہ اس کا بیشتر حصہ موذی امراض کی زد میں ہے لیکن ایک امید افزا کرن یہ بھی ہے کہ امراض لاعلاج نہیں بشرطیکہ کوئی خلوص اور نیک نیتی سے علاج کی کوشش کرے۔ موجودہ نسلوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ آئندہ نسلوں کے لئے صحت منداور بہتر معاشرہ ورثے میں چھوڑے۔ یہ ان پر فرض بھی ہے اور قرض بھی۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کی نسل نے اس ذمہ داری کو محسوس کیوں نہیں کیا جبکہ اس وقت یہ زہر اس طرح رگ رگ میں سرایت بھی کرنہیں پایا تھا اور اس کا تریاق نسبتاً آج کے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ آپ لوگ خاموش تماشائی بنے لحہ بہ لحہ دم توڑتے ہوئے اس معاشرے کی جانکنی کا منظر دیکھتے رہے اور اپنے دامن کو سمیٹے اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ اس کے جراثیم آپ تک نہیں پہونچ سکتے لیکن کیا ان سے بچنا ممکن ہوا؟ آج ایک پوری کی پوری بیمار نسل اپنی مایوس آنکھوں میں آپ لوگوں کی عدم توجہی کے شکوے لئے قریبُ المرگ ہے''۔

''لیکن تم تو اس زہر سے محفوظ رہے''۔ صدیق عالم پیچ وتاب کھاتا ہوا بولا۔ ''تم تک تو میں نے ان جراثیموں کو پہونچنے نہیں دیا۔ میں نے ان متعدی مریضوں کے درمیان رہ کر بھی تمہیں صحت مند رکھا۔ کیا دوسرے لوگ اسی طرح اپنی نسلوں کو صحت مند نہیں رکھ سکتے تھے''؟

''یہ آپ کا خیال ہے کہ میں آپ کی احتیاطی تدابیر کی وجہ کر محفوظ رہا۔ لیکن میرے خیال میں یہ محض ایک اتفاق ہے۔ دوسرے لوگوں نے بھی اپنے بچوں کے لئے احتیاطی قدم اٹھائے ہوں گے لیکن اتفاقات سب کے ساتھ پیش نہیں آتے وبا سے محفوظ رہنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ وبائی جراثیم کو ختم کر دیا جائے نہ کہ ان کو افزائش نسل کی چھوٹ دے کر خود خلوت نشیں ہو جائیں۔ آپ لوگوں نے احتیاط کی قبا میں مصلحت کو پوشیدہ رکھا اور کسی شتر مُرغ کی طرح ریت میں گردن چھپا کر باہری طوفان سے خود کو محفوظ سمجھا۔ آپ لوگوں کا یہ قرض سود در سود بڑھ کر ہماری نسلوں کے سر آپڑا ہے۔ اب اس قرض کو چکانا ہی ہمارا نصبُ العین ہے''۔

''نصب العین جتنے بھی پیارے ہوں زندگی سب سے پیاری ہوتی ہے۔تم جس راہ پر چلنے کی کوشش کر رہے ہو وہ نقصان کا راستہ ہے۔ ہر سفر میں فائدے کو مدنظر رکھو کہ یہی کامیابی کی کلید ہے۔تم جو کر رہے ہو کیا تمہیں اس میں کسی کامیابی یا فائدے کا امکان ہے''؟

''فائدے اور نقصان کی فکر تو سوداگر کرتے ہیں۔اگر مادی فائدے کو ہی مسلم حقیقت سمجھ لیا جائے تو گوتم سے لے کر گاندھی کی شخصیت تک بے وقعت ہو کر رہ جائے گی اور پھر کامیابی کی ضمانت چاہنے والے ہم کون؟ ہمیں تو صرف قرض چکانا ہے''۔

صدیق عالم نے بے طرح کوشش کی کہ خطرناک موڑ پر مڑتے ہوئے اس کے قدموں کو روک لے۔اسے اپنے خوابوں اور آرزوؤں کا واسطہ دیا۔رحمو کی بھیانک شخصیت اور فضا میں چھائی ہوئی اس کی دہشت سے آگاہ کیا لیکن جوانی کے جوشیلے اور پر عزم قدموں میں کوئی لرزش نہیں ہوئی اور وہ دل میں ڈھیر سارے اندیشے لئے خوفزدہ نظروں سے اس کی پشت کو دیکھتا رہا۔

وہ دیر تک غور کرتا رہا کہ اس سے اپنے بیٹے کی پرورش میں کہاں پر بھول ہوئی کہ اس کا بیٹا اس کے دکھائے ہوئے راستے کو بھلا بیٹھا۔اس نے عمر بھر کوشش کی کہ پرویز سماج کے اس گھناؤنے روپ سے آشنا نہ ہونے پائے جس پر نفریں کر کے اس نے گوشۂ عافیت میں پناہ لی تھی۔وہ بزدل نہیں تھا لیکن حالات کے زنداں کا اسیر ہو کر اس نے مصلحت کی بیڑیاں پہن لی تھیں اور اب تو حالات اور بھی خراب تھے۔ بے کاری اور بے روزگاری سے تنگ آ کر آج اچھے خاصے شریف گھرانوں کے لڑکے جرائم پیشہ گروہ میں شامل ہو گئے تھے بعض نے تو محض اس بنا پر شمولیت اختیار کر لی تھی کہ موجودہ حالات میں مجرموں کو ہی سماج میں سب سے بلند مقام حاصل تھا۔لوگوں کے لئے ان کی شخصیت قابل تعظیم اور قابل رشک تھی اور ان کی قربت سے ان کی بھی دیرینہ محرومیوں کا ازالہ ہو سکتی تھی۔گرچہ علاقے میں اب بھی اکثریت شریفوں کی تھی لیکن بدمعاش اس طرح غالب اور نمایاں ہوتے گئے کہ شریفوں کی شناخت ہی کھو گئی۔ ہر فرد ڈرا سہما ہوا زندگی کا زینہ طے کر رہا تھا۔اس کے کانپتے ہوئے پیر ہر ایک زینے پر یوں ٹھٹکتے مانو دوسرا ہی قدم موت کے گڈھے میں پڑنے والا ہے۔

اس دوران کتنے ہی لوگوں نے ڈھکے چھپے لہجے میں اس سے اس کے بیٹے کے پاگل پن کا تذکرہ کیا اور سرگوشیوں میں رحمو اور اس کے غنڈوں کی ممکنہ کاروائی سے بھی آگاہ کیا لیکن وہ دل وجان سے چاہتے ہوئے بھی پرویز کے معمولات پر پابندی نہ لگا سکا۔ اور پھر وہ حادثہ ہو ہی گیا جس کی بہت سارے لوگوں کو توقع تھی۔ روز روشن میں پرویز کو قتل کر دیا گیا۔ اس کے جوان اور صحت مند جسم پر چاقوؤں کے بیسوں زخم تھے جو قاتلوں کی درندگی کے مظہر تھے۔ صدیق عالم کو اس جانکاہ حادثے کی اطلاع ملی تو اس کا دل یکبارگی اُچھلا اور پھر بارش زدہ مٹی کی دیوار کی طرح بیٹھ گیا۔ اس کا وجود جیسے ہوا میں معلق ہو گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں یوں خلا میں کانپتے رہے مانو کسی سہارے کی تلاش میں ہو۔ آہستہ آہستہ پاؤں زمین پر ٹکے تو اس کا وجود بے حس وحرکت ہو چکا تھا۔

پولیس آئی اور رسمی کاروائی کے بعد مردہ جسم کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا گیا۔ سینکڑوں عینی شاہدوں کی موجودگی میں ہونے والے اس واقعے کا کوئی گواہ پولیس کو نہ مل سکا اور وہ ناکام لوٹ گئی اور لوگوں نے راحت کی سانس لی۔ دوسرے دن ہسپتال سے لاش لائی گئی اور اس کی تجہیز و تکفین کے انتظامات کئے جانے لگے۔ جنازے میں کافی بھیڑ تھی۔ تمام لوگ اس کی جوان موت پر افسردہ تھے۔ کچھ کفِ افسوس مل رہے تھے اور کچھ اس کی ناعاقبت اندیشی اور ناسمجھی پر ماتم کر رہے تھے جس کی وجہ کر رحمو دادا کو اشتعال آ گیا تھا۔ اب رحمو سے دشمنی مول لے کر کوئی سانس لے سکتا تھا بھلا تدفین کے بعد مقتول کی بخشش کی دعائیں مانگی گئیں اور پھر سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ اس سارے عمل میں صدیق عالم کسی معمول کی طرح دوسروں کے اشارے پر حرکت کرتا رہا۔ اس کی سنسان آنکھوں میں عجیب سی بے گانگی اور وحشت تھی جیسے یکایک وہ سارے منظر سے لاتعلق ہو گیا ہو۔

دوسرے دن علی الصباح سورج کی نرم ونازک کرنیں دھرتی کے سخت پنجوں کی گرفت میں بھی نہیں آئی تھیں۔ سڑکیں اور گلیاں عموماً سنسان تھیں۔ اکا دکا لوگ فجر کی نماز کے لئے مسجد کی طرف جا رہے تھے ابھی تک کسی کی نگاہ صدیق عالم پر نہیں پڑی تھی۔ وہ وحشت زدہ چہرہ اور ویران آنکھیں لئے چوراہے کے ایک چبوترے پر بیٹھا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں میں کچھ تھامے ہوئے تھا جو کہاسے کی

وجہ کر صاف دکھائی نہیں پڑ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے روشنی پھیلتی گئی، کہاسا چھٹتا گیا اور صدیق عالم کے گرد بھیڑ بڑھتی گئی۔ بھیڑ کے سامنے ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ صدیق عالم کے ایک ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی کی چھڑی پر قمیض اور پتلون ٹنگی تھی۔ دونوں ہی کپڑے خون آلود اور سوراخ زدہ تھے۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک تختی تھی جس پر سُرخی مائل سیاہی میں نمایاں طور پر یہ جملہ تحریر تھا۔

''میرے بیٹے کا قرض معاف کردو''۔

اس کی ہیئت کذائی اور اس عجیب و غریب جملے پر سبھوں کو یقین ہوگیا کہ بیٹے کی موت کے غم نے اس کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا ہے۔ وہ لوگ اس کی عبرت ناک حالت پر افسردہ ہو گئے اور اس جملے کی معنویت اور مقصدیت پر غور کرنے لگے۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ آخر کون سے قرض کی معافی کا صدیق عالم خواستگار تھا۔ اس کے بیٹے کی حالت زندگی کے اوراق الٹے جانے لگے۔ اس کے عقائد و خیالات زیر بحث آئے، لیکن کسی طرح یہ عقدہ نہ کھلا۔ آخر اس کی اصلاحی تحریک سے وابستہ کسی شخص نے محتاط انداز اور دبے لہجے میں اس جملے کے مفہوم کی وضاحت کی کہ پرویز خود کو اس سماج، اس مٹی کا مقروض تصور کرتا تھا اور اسی قرض کی ادائیگی کے لئے اس نے مقدور بھر کوشش کی اور انجام کار اپنی جان گنوا بیٹھا لیکن لا حاصل کہ قرض تو سر پر چڑھا رہا۔

حقیقی صورت حال سے آگاہ ہو کر لوگوں کے سر ایسے مقروض کی جھک گئے جن میں قرض ادا کرنے کی سکت نہ ہو اور وہ قرض خواہ سے آنکھیں نہ ملا پا رہے ہوں کانوں کے ذریعہ سرگوشیوں میں سفر کرتی ہوئی یہ خبر پوری بھیڑ میں گردش کر گئی اور بھیڑ کے ذریعہ علاقے کے گلی کوچوں میں پھیل گئی۔ اسے سُن کر کچھ ہنسے، کچھ نے افسوس ظاہر کیا اور بہتوں نے کوئی توجہ نہیں دی۔

اور پھر یہ روز کا معمول ہوگیا۔ صبح سویرے صدیق عالم دونوں ہاتھوں میں دونوں چیزیں لئے اسی چبوترے پر آبیٹھتا اور خاموش آنے جانے والوں کی صورتوں کو تکتا رہتا پھر رات ہوتے ہی اپنے گھر کو چل دیتا۔ ہفتے بیتے، اور ہفتے مہینے میں تبدیل ہو گئے لیکن اس کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ لوگ اب اس کا سامنا کرنے سے کترانے لگے تھے لیکن کرتے بھی کیا کہ خاص شاہراہ ہی وہی

تھی ۔ تختی پر کندہ الفاظ پر نظر پڑتے ہی انکے چہروں پر طمانچہ سا لگتا اور وہ بھیتر ہی بھیتر چھٹپٹا کر رہ جاتے لیکن اس طمانچے کے ردعمل میں کچھ بھی کرنے سے معذور تھے کہ کرتے بھی کیا؟ طمانچہ مارنے والے ہاتھ تو انہیں کے تھے اس کی ویران آنکھوں میں دیکھتے ہی کوئی نادیدہ قوت انہیں کسی بیری کے جھاڑ کی طرح جھنجھوڑ دیتی اور وہ بوکھلا کر اس کے قریب سے تیز تیز قدموں سے گزر جاتے ۔ دھیرے دھیرے صدیق عالم کا وجود کسی آسیب کی طرح تمام علاقے کو اپنی گرفت میں لئے جا رہا تھا اور ہر شخص آسیب زدگی کی کیفیت میں مبتلا ہوتا جا رہا تھا۔ سوتے وقت جاگتے وقت کوئی کام کرتے وقت یکا یک کسی نامحسوس طریقے سے اس کا شکستہ اور خستہ وجود ہاتھوں میں تختی لئے ہوئے ان کے سامنے آموجود ہوتا جس پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوتا...... ''میرے بیٹے کا قرض معاف کردو''۔ اور وہ بوکھلا کر آنکھوں کو ملتے، ہاتھوں کو جھٹکے دیتے اور اس کے خیالی پیکر کو جھٹک کر بے ترتیبی سے اپنے کاموں میں مصروف ہونے کی کوشش کرنے لگتے۔

اس روز صدیق عالم کے چاروں طرف ایک بھیڑ جمع تھی اور ہر ایک کی آنکھیں دھڑکتے دل سے پیش آنے والے کسی اندوہناک واقعے کی منتظر تھیں۔ صدیق عالم کے قریب رحمو دادا اور اس کے ساتھی کھڑے تھے۔ رحمو کمر پر دونوں ہاتھ رکھے غیظ کے عالم میں صدیق عالم سے مخاطب تھا۔

''کیوں بے؟ اپنے بیٹے کی موت سے تشفی نہیں ہوئی جو یہ سوانگ رچائے بیٹھا ہے۔ اس کے خون سے سنے ہوئے کپڑوں کو ہاتھوں میں لئے ہوئے بھی اس کے خون کو بھول گیا۔ اس کا جوان بدن تو تھوڑا تڑپا بھی تھا لیکن تیرا یہ بوڑھا جسم تو چاقو کا ایک وار بھی نہیں سہہ سکتا''۔

صدیق عالم خالی خالی ویران آنکھوں سے رحمو کو تکتا رہا۔ اس کے ساکت لبوں میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ نہ جانے اس کی آنکھوں میں کون سا تیر چھپا تھا کہ رحمو یکا یک چھٹپٹا اٹھا اور غصے سے کانپتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

''اس کے ہاتھوں سے یہ کپڑے اور تختی چھین کر جلا دو۔ سالا نوٹنکی کرتا ہے''۔

حکم کی تعمیل کے لئے اس کے غنڈے صدیق عالم کی طرف جھپٹے اور اس کے ہاتھوں سے خون آلود کپڑے اور تختی چھین لائے۔ اس نے کوئی مدافعت نہیں کی بس خاموشی سے انہیں تکتا رہا۔

ان میں سے ایک نے ماچس کی ڈبیا نکالی اور تیلی جلا کر کپڑے سے سٹا دیا۔ خون سے سنا پرانا کپڑا تیلی دکھاتے ہی دھو دھو کر جلنے لگا۔ جلتے ہوئے کپڑوں پر انہوں نے تختی بھی ڈال دی۔ دونوں شئے جلتی رہی، شعلے بلند ہوتے رہے اور وہاں کھڑی بھیڑ ان شعلوں کی تمازت کو محسوس کرتی رہی۔

اچانک نہ جانے کیا ہوا؟ جانے کس اضطراری کیفیت میں تمام بھیڑ رحمو اور اس کے غنڈوں پر ٹوٹ پڑی۔ غنڈے اس اچانک حملے سے بوکھلا گئے اور خود کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے لیکن بھیڑ تو جیسے دیوانی ہو چکی تھی اور اسی دیوانگی کے عالم میں لات اور گھونسے غنڈوں پر برس رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں سڑک پر رحمو کے ساتھ ساتھ پانچ غنڈوں کی لاشیں بچھی تھیں اور بھیڑ یوں ساکت اور پرسکون ہو گئی تھی جیسے مکمل نیند سو کر جاگی ہو۔

صدیق عالم ایک ٹک ان لاشوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے ایک نظر جاگی ہوئی بھیڑ پر ڈالی اور پھر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

☆☆☆☆☆

آگہی

اس کے ملنے سے قبل مجھے انگوٹھوں کی قدر و قیمت کا مطلق اندازہ نہیں تھا۔ اب جو شئے موجود ہی نہ ہو، چاہے وہ زندگی کیلئے کتنی ہی اہم کیوں نہ ہو، بغیر کسی ذاتی تجربے کے اس کی اہمیت و افادیت کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے ہاتھوں کو انگوٹھوں سے محروم ہی پایا۔ ان کی عدم موجودگی سے بہت ساری روایتیں منسوب تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ میں ایام طفلی میں بے حد کند ذہن تھا اور اسی کند ذہنی کے باعث میں نے اپنے انگوٹھوں کو ایک چارہ کاٹنے والی مشین میں ڈال دیا اور انہیں گنوا بیٹھا جبکہ بعض افراد اس حادثے کو میری شرارت کا خمیازہ مانتے تھے۔ ان کے مطابق مجھے یہ سزا قدرت کی طرف سے میری شرارت کی پاداش میں ہی ملی تھی۔ معدودے چند ایسے بھی تھے جن کا یقین تھا کہ میرے انگوٹھوں کو جبراً کاٹ ڈالا گیا تھا۔ اب روایتوں میں جتنے بھی ابہام ہوں لیکن یہ ایک روشن حقیقت تھی کہ میرے ہاتھوں میں انگوٹھے نہیں تھے۔ اور مجھے ان کے نہ ہونے سے کوئی خاص پریشانی بھی نہیں تھی۔ یہ اصولِ فطرت ہے کہ ناموجود عضو کی کمی کی تلافی کے لئے موجود اعضاء میں ہی اضافی صلاحیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ میری انگلیوں نے بھی ذہنی طور پر اس کمی کو قبول کرلیا تھا اور ان کی فاضل ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی تھی۔ میری انگلیاں زیادہ تر وہ کام بحسن وخوبی کر لیتی تھیں جو انگوٹھوں کے تعاون کے بغیر مشکل تھا اور میں کسی محرومی کے احساس سے یکسر عاری ہو کر مطمئن سی زندگی گذار رہا تھا کہ اس سے ملاقات ہوگئی۔

یہ ملاقات بالکل اتفاقیہ تھی۔ ذرائع ابلاغ سے معلوم ہوا کہ ملک کا مقبول ترین قلم کار سی۔ ی۔ راشد ایک سڑک حادثے میں بری طرح زخمی ہو کر ہسپتال میں داخل ہے۔ وہ میرا ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ میرا اچھا دوست بھی تھا۔ حالانکہ اسے جس قدر عوامی مقبولیت اور شہرت حاصل تھی وہ میرے لئے خواب جیسا تھا اس کے باوجود میں کسی احساس کمتری میں مبتلا ہوئے بغیر اس کی

دوستی میں مخلص تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی یہ مقبولیت، یہ شہرت تمام کی تمام عارضی ہیں۔ میرے خیال میں وہ اپنی تخالیق سے روشنی کی ایک لکیر کھینچتا ہوا معصوم و محروم لوگوں کو اپنے عقب میں جس خواب جہاں کی طرف لئے جارہا تھا حقیقتاً اس جہاں کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ عالم غنودگی میں مبتلا لوگوں پر جب یہ حقیقت آشکار ہوتی تو اس کے تیئں ان کی محبت اور وفاداری یک لخت غم و غصہ اور بغاوت میں تبدیل ہو جاتی۔ میرے شدید اختلاف کے باوجود وہ اپنے نظریۂ فن و فکر سے ایک انچ بھی ہٹنے کو روادار نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا ہو سکتا ہے وہ جہاں ایک خواب ہی ہو لیکن اس جہاں کی اس نے جو تفصیل اور تصویر پیش کی ہے اور لوگوں نے جتنی گہرائی اور شدت سے انہیں Adopt کیا ہے اگر وہ جہاں نہ بھی ملا تو وہ خود ہی اسے تشکیل کر لیں گے۔ میرا اعتراض تھا کہ وہ جہاں تو غیر حقیقی ہے ہی اس کے پیش کردہ خدوخال بھی اتنے غیر حقیقی ہیں کہ یہ تشکیل ممکن ہی نہیں۔ نظریاتی طور پر اس اختلاف کے باوجود ہم میں ایک قدر مشترک تھی کہ ہم دونوں ہی اپنے اپنے طریقہ کار سے ظلم و استحصال کے خلاف محاذ آرا تھے۔

اس کے حادثے کی خبر سن کر میں پہلی فرصت میں اسکے قریب پہنچ گیا۔ ہسپتال میں اسپیشل وارڈ کے باہر بچھی کرسیوں پر اس کی بیوی اور بچے پریشان اور مضمحل سے بیٹھے تھے۔ ان کے علاوہ ایک اور شخص بے حد فکر مند اور فعال تھا۔ میں نے اس شخص کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ اسے بار بار دیکھنے کے لئے کوئی بھی شخص مجبور ہو سکتا تھا۔ بلند قد و قامت اور سرخ و سپید چہرے پر سب سے قابل توجہ اسکی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ ایسی زندہ، روشن اور متحرک آنکھیں میں نے شاید ہی پہلے کبھی دیکھی ہوں۔ بعد میں اس کے ساتھ کچھ وقت گذارنے اور اس کی آنکھوں میں بغور دیکھتے رہنے پر ایک عجیب و غریب مشاہدہ ہوا۔ اسکی آنکھوں میں بیک وقت دو متضاد کیفیتیں ابھرتی تھیں۔ محبت و نفرت، حزن و مسرت اور نرمی و سختی جیسے متضاد رنگوں کا ایک ساتھ جھلکنا حیرت انگیز امر تھا۔

راشد کے بیٹے سے معلوم ہوا کہ فوری طور پر اعلیٰ درجے کا ہسپتال اور علاج میسر ہو جانے کی وجہ سے راشد کی جان بچ گئی۔ اور اب وہ خطرے سے باہر ہے۔ گرچہ کچھ ہڈیاں فریکچر ہو گئی

ہیں لیکن اسکے لئے فکر مند یا خوفزدہ ہونے والی بات نہیں۔ اسی سے یہ جان کاری ملی کہ راشد کی جان بچانے میں اس شخص کا بڑا ہاتھ تھا اگر وہ بذات خود مداخلت نہیں کرتا تو ایسا خاص الخاص علاج ممکن بھی نہیں تھا۔ اس کے علاج پر جو کثیر رقم خرچ ہو رہی ہے اسے وہی برداشت کر رہا تھا۔ دراصل راشد کا اسکوٹر جس ٹرک سے ٹکرا گیا تھا اسکا مالک وہی شخص تھا۔ حالانکہ عینی گواہوں کے مطابق ٹرک ڈرائیور کی کوئی غلطی نہیں تھی بلکہ نشے کی زیادتی کی وجہ سے راشد ہی اپنا اسکوٹر سنبھال نہیں پایا تھا۔ اس شخص سے باضابطہ تعارف ہونے پر یہ جان کر کچھ زیادہ ہی حیرت ہوئی کہ وہ ملک کا مشہور اور کامیاب ترین انڈسٹریلسٹ اودے سنگھ امکانی ہے۔ میرا نام سن کر وہ بے حد گرم جوشی سے پیش آیا۔ میرے ہاتھوں کو والہانہ انداز میں دباتے ہوئے بولا۔

”میں آپ لوگوں کا بیحد قدر دان ہوں۔ مجھے جیسے ہی علم ہوا کہ اس حادثے کا شکار راشد صاحب ہیں تو اپنی تمام مصروفیت تج کر چلا آیا۔ اوپر والے کا شکر ہے کہ اس نے میری لاج رکھ لی۔ ورنہ میں خود کو کبھی معاف نہیں کر پاتا......“

اس سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ گفتگو کے دوران میں اس کی ایک ایک ادا سے متاثر ہوتا رہا۔ غضب کی باغ و بہار شخصیت تھی اسکی۔ یوں تو اس کے لہجے میں انکسار ہی انکسار جھلکتا تھا لیکن اس میں ایک ایسا تحکم بھی پوشیدہ تھا کہ اس کی باتوں سے انحراف کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ اسی لئے جب اس نے مجھے دوسرے دن اپنے گھر کھانے پر بلایا تو میں انکار نہیں کر پایا۔

اس کے عظیم الشان بنگلے میں قدم رکھتے ہوئے میں اسکی شان و شوکت کا قائل ہوتا گیا۔ اس نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ہلکی سی شراب نوشی کے بعد ہم کھانے کی میز پر پہنچے۔ کھانے کے دوران طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کی باتوں سے احساس ہوا کہ نہ صرف وہ میری تخالیق سے مکمل طور پر واقف ہے بلکہ کچھ تخالیق تو اسے زبانی یاد ہیں۔ بجا طور پر یہ میرے لئے قابل فخر بات تھی۔ چونکہ اب تک ادب ہی موضوع گفتگو تھا اس لئے ماحول بالکل سنجیدہ ہی تھا کہ اچانک وہ کچھ ہنس کر بولا۔

”آپ نے خود کو کبھی کھانا کھاتے ہوئے آئینے میں دیکھا ہے“؟

''جی!؟''میں نے شدید حیرت سے اس کے متبسم چہرے کو دیکھا۔

''آپ کے ہاتھ میں انگوٹھے نہ ہونے کی وجہ سے کھانا کھاتے وقت عجیب مضحکہ خیز منظر پیدا ہو جاتا ہے۔اب ہم لوگ کھاتے ہیں تو نوالے کو منہ میں ڈالنے کیلئے انگوٹھا ہی سب سے اہم کردار ادا کرتا ہے۔یہ دیکھئے اس طرح''۔

اس نے ہاتھ میں نوالہ اٹھایا، چاروں انگلیاں منہ میں ڈالیں اور پھر انگوٹھے سے ڈھکیلتے ہوئے نوالے کو منہ میں ڈال لیا۔یہ سارا عمل اتنی آسانی اور نفاست سے ہوا کہ میں آواک سا دیکھتا رہ گیا۔سچ مچ اس کے مقابلے میں میرا کھانے کا انداز کچھ بے ڈھب اور بے ڈھنگا ہی تھا۔زندگی میں پہلی بار انگوٹھوں کی غیر موجودگی پر مجھے بری طرح شرمندگی کا احساس ہوا۔

''سچ!انگوٹھے تو بے حد کارآمد اور ضروری ہیں۔کیا آپ کو ان کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی''؟

ابھی ابھی چند لمحے قبل اس کی تعریف و توصیف اور قدر دانی پر میرے اندر احساس تفاخر کا جو بلند مینار کھڑا ہوا تھا یکلخت وہ ڈھ گیا۔میں اپنے اندرونی کرب کو چھپاتا ہوا شکست خوردہ آواز میں بولا۔''جی میں نہیں سمجھتا کہ انگوٹھے انتہائی ضروری ہیں۔میں انکے بغیر بھی اچھی خاصی اور مکمل زندگی گذار رہا ہوں''۔

''جی نہیں''!وہ قطعی لہجے میں میری بات کی تردید کرتے ہوئے بولا۔''آپ زندگی گذار رہے ہیں لیکن مکمل نہیں۔آپ کی زندگی میں ڈھیروں خلا ہیں۔کیا آپ پانی یا شراب کا ایک گلاس بھی قاعدے سے پکڑ سکتے ہیں؟صبر و قناعت اچھی چیزیں ہیں لیکن یہ کسی محرومی کا ازالہ نہیں بن سکتیں۔زیادہ سے زیادہ اس محرومی کو قبول کرنے کے لئے ذہن کو آمادہ ہی کر سکتی ہیں۔دنیا میں ایسے بہت سارے کام ہیں جو آپ بغیر انگوٹھوں کے تعاون کے کبھی نہیں کر سکتے۔اچھا ایک چھوٹا سا لیکن بے حد اہم کام۔کیا آپ چٹکی بجا سکتے ہیں؟اس طرح''۔

اس نے اپنے انگوٹھے اور بیچ کی انگلی کو ملا کر چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔میں نے تعجب سے اس کی جانب دیکھا۔

''اگر میں چٹکی نہیں بجا سکتا تو اس میں کیا نقصان ہے''؟

''یہی تو قابل غور امر ہے۔ ذاتی تجربہ نہ ہو تو ہر عمل بے فیض نظر آتا ہے۔ آپ بڑے سے بڑے مسئلے کو چٹکی بجا کر حل کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے تمام فکر و غم کو چٹکیوں میں اڑا سکتے ہیں۔ یہ عمل آپ کو بالکل بے فیض نظر آتا ہے لیکن میرے تجربے کے مطابق انگوٹھے کا سب سے اہم مقصد چٹکی بجانا ہی ہے۔ اچھا ایک بات پوچھوں آپکی عمر کتنی ہوگی''؟

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اپنی عمر بتائی...... ''یہی ۴۷ یا ۴۸ سال ہوگی''۔

''کیا آپ اندازہ لگا کر بتا سکتے ہیں کہ میری عمر کتنی ہوگی''؟

میں نے اس کے صحت مند چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا''۔ میرے خیال میں آپ مجھ سے پانچ چھ سال چھوٹے ہونگے''۔

''جی نہیں! میں آپ سے بہت زیادہ بڑا ہوں''۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا''۔ اور میری اتنی اچھی صحت اور جوانی کا راز بس اتنا ہے کہ میں چٹکی بجا سکتا ہوں۔ اس لئے کوئی بھی مسئلہ میرے لئے لاینحل نہیں ہوتا اور نہ ہی کوئی غم میرے قریب پھٹکتا ہے''۔

میں دیر تک اس کی باتوں کی صداقت اور اہمیت پر غور کرتا رہا۔ حیرت انگیز طور پر آہستہ آہستہ مجھ پر منکشف ہوتا گیا کہ بغیر انگوٹھوں کے زندگی عبث ہے۔ مجھے ہر وہ کام یاد آتا گیا جو میں انگوٹھوں کے نہ رہنے کے باعث کرنے سے مجبور تھا۔ میں جس قدر بھی خوش فہمی میں مبتلا رہوں۔ لیکن یہ ایک تلخ حقیقت تھی کہ میں ایک قابلِ رحم معذور شخص تھا۔ مجھے شدت سے خواہش ہونے لگی کہ کاش کسی بھی صورت میری اتنی بڑی محرومی کا ازالہ ہو سکتا۔ میں گہری شرمندگی کے زیرِ اثر اس شخص سے نگاہیں چرانے کی کوشش کرنے لگا جو بڑی محویت سے میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ کافی دیر تک ماحول پر بوجھل سی خاموشی چھائی رہی۔ معاً اس نے سرگوشیوں میں مجھے مخاطب کیا۔ ''اگر آپ چاہیں تو میں اس عظیم نقصان کی تلافی کر سکتا ہوں۔ میں آپکو عاریتاً انگوٹھے دے سکتا ہوں''۔

''کیا''؟ میری حیرت ایک ناقابل بیان خوشی کے بوجھ تلے دبتی چلی گئی۔

''جی ہاں''! میں آپکا زبردست مداح ہوں اس لئے آپکی خاطر یہ قربانی دینے کے لئے تیار ہوں۔ میرے دیئے ہوئے انگوٹھوں کو آپ بلا تکلف اپنے ہر استعمال میں لا سکتے ہیں۔ بس ایک چھوٹی سی شرط ہوگی''۔

''وہ کیا''؟ میں نے بے ساختگی سے پوچھا، ذہنی طور پر میں اس کی پیشکش کو قبول کرنے کے لئے بالکل تیار ہو چکا تھا۔ میرے لئے اسکی یہ پیشکش نعمت غیر مترقبہ تھی۔

''گرچہ یہ انگوٹھے ہمیشہ آپ کے حکم کے تابع رہیں گے لیکن کبھی کبھی پل دو پل کے لئے یہ اپنی مرضی سے آزادانہ حرکت کر سکیں گے''۔

میں نے اس شرط کا گہرائی سے جائزہ لیا اور مجھے اس میں کوئی بڑی خرابی نظر نہیں آئی۔ بھلا انگوٹھوں کی بساط ہی کیا۔ کبھی کبھی یہ آزادانہ حرکت کر بھی لیں تو میرا کیا بگڑ سکتا تھا۔ اور میں نے ہامی بھر دی۔

انگوٹھوں کی فراہمی کے بعد میری زندگی میں ایک نہایت خوشگوار اور روشن انقلاب آیا۔ میں نے جانا کہ انگوٹھے کارِ حیات میں کتنا لازمی اور اہم مقام رکھتے ہیں۔ اور سچ مچ چٹکی بجانا کتنا کارگر اور مفید ہے۔ اب میں ہر مسئلہ ہر غم سے نجات پا چکا تھا۔ میری صحت تیزی سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ میرے چہرے سے وہ صحت مند سرخی جھلکنے لگی تھی جو بے فکر زندگی کی پہچان ہے۔ اب میرے ہر قدم میں ایک مضبوطی اور استحکام پیدا ہو چکا تھا۔

اس مدت میں ان انگوٹھوں نے میری مرضی کے خلاف آزادانہ طور پر کچھ حرکتیں کیں لیکن یہ اتنی بے ضرر تھیں کہ میں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ہاں ایک بار اس کی حرکت بیحد ناگوار گذری۔ میں ایک ایسی محفل میں شریک تھا جس میں ملک کے معزز اور سر برآوردہ افراد شامل تھے۔ شراب کا پہلا گلاس ختم کرنے کے بعد میں نے دوسرا اٹھایا ہی تھا کہ یکلخت انگوٹھا میرے اختیار سے باہر ہو گیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی گلاس زمین پر گر پڑا اور ساری شراب قیمتی دبیز قالین میں جذب ہو گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کے استہزائیہ قہقہے ابل پڑے۔ انہیں شاید گمان ہوا کہ مجھے شراب کی ذرا بھی سہار نہیں اور میں ایک ہی پیگ میں ہوش وحواس کھو بیٹھا ہوں۔ جہاں تہذیب اور سلیقے کو

پیانوں کی تعداد سے ہی ناپا جاتا ہو وہاں لوگوں کے اس گمان پر مجھے بیحد خفت اور شرمندگی ہوئی۔ انگوٹھے کی اس غیر مہذب حرکت پر میں دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا ہوا لوٹ آیا۔

خیر اسے میں جلد ہی بھول گیا۔ لیکن اس روز کی حرکت نے مجھے ان کے متعلق کچھ سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کر دیا۔ صبح سویرے میں چائے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میرا دیرینہ نمک خوار ملازم سسکیاں بھرتا ہوا میرے پاس پہنچا۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ میرے بڑے بیٹے نے بلاوجہ اشتعال میں آکر اسے زدوکوب کیا تھا۔ اس کے دائیں گال پر طمانچے کا واضح نشان تھا اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ اپنے بیٹے کا یہ حیوانی عمل مجھے سخت ناگوار گذرا۔ پشیمانی اور ہمدردی کے جذبے سے مغلوب ہو کر میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور اس کے آنسوؤں کو پونچھنے کیلئے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ انگوٹھا اپنی من مانی پر اتر آیا۔ اس سے قبل کہ میں کچھ سوچ پاتا اس نے خود کو اس کی اشک آلود آنکھوں میں گھسا دیا۔ ملازم درد کی شدت سے چھٹپٹایا اور چیختا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔ میں غم وغصے کی مورتی بنا انگوٹھے کی اس سرکشی پر اواک سا کھڑا رہ گیا۔ اس لمحہ میں نے سوچا کہ یہ انگوٹھے کچھ کچھ ناقابلِ برداشت ہوتے جا رہے ہیں۔ اور اس سے پہلے کہ یہ میرے لئے کوئی بڑی پریشانی کھڑی کریں ان سے نجات حاصل کر لینا عقلمندی ہے لیکن ناگہاں مجھے ان کی موجودگی سے پیشتر کی محرومیاں اور معذوریاں یاد آتی گئیں اور میں بری طرح سہم گیا۔ میں نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ان سے حاصل ہونے والے مسلسل فیض کے مقابلے میں کبھی کبھی یہ، ہلکی پھلکی پریشانی یا پشیمانی قابل درگذر ہیں۔ آئندہ احتیاط برتونگا کہ یہ ایسی کوئی حرکت نہ کرنے پائیں جو میری ذلت و رسوائی کا باعث ہو۔

کچھ عرصہ اطمینان اور سکون سے گذرا۔ میں ان انگوٹھوں کے ذریعہ گذشتہ محرومیوں کا برق رفتاری سے ازالہ کرتا رہا کہ وہ واقعہ ہوا جس نے کسی تیز وتند آندھی کی طرح میرے وجود کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ میرے گھر سے منسلک تھوڑی سی زمین تھی جسے میں نے چھوٹے سے خوبصورت باغیچے میں تبدیل کر رکھا تھا۔ اس زمین کے کچھ حصے پر میرے پڑوسی کا ناجائز قبضہ تھا اور وہ باقی پر بھی دعویٰ رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں طویل عرصے سے ہمارے درمیان تنازعہ تھا۔ ایک دوبارہ یہ تنازعہ باہمی تصادم

میں بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ ان دنوں میں نے خلوص دل سے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ برسوں کے اس تنازعے کو حل کرنے کیلئے کوئی ایسی راہ نکالی جائے کہ یہ تلخی اور بدگمانی کی فضا ختم ہو۔ اس کیلئے بہتر صورت یہی تھی کہ کسی مفاد پرست ثالث کی موجودگی کے بغیر آپسی گفتگو کے ذریعہ کسی ایسے حل پر پہونچا جائے جو دونوں کے لئے قابل قبول ہو۔ میں نے پہل کی اور کچھ ردوکد کے بعد ادھر سے بھی رضامندی ظاہر کی گئی۔ دو تین ملاقاتوں کے باوجود کوئی امید افزا کرن نظر نہیں آئی لیکن میں مایوس نہیں تھا۔

ایک روز گفتگو کے دوران اس کے لہجے میں کچھ تلخی در آئی۔ میں نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کہ ماحول کو تلخ بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اول تو اس کا دعویٰ ہی غلط اور ناجائز ہے پھر بھی یہ میری شرافت اور صالح ذہنیت کی پہچان ہے کہ میں اس مسئلے کو گفتگو کے ذریعہ ہمیشہ کیلئے ختم کر کے آئندہ اچھے پڑوسیوں کی طرح رہنا چاہتا ہوں۔ میری نرمی کو شاید اس نے بزدلی پر محمول کیا اور وہ کچھ اور شیر ہو گیا اور باقی زمین پر بھی زبردستی قبضہ کرنے کی دھمکی دینے لگا۔ میں ہر ممکن حد تک معاملے کو بڑھانے سے گریز کرنا چاہتا تھا اس لئے اس کی احمقانہ دھمکی کو نظرانداز کرتا ہوا بولا۔

''آپ خواہ مخواہ اشتعال میں آرہے ہیں۔ بات وہ کیجئے جو قابل عمل ہو۔ میں کسی لڑائی سے گریز کرنا چاہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ میں کمزور ہوں۔ بلکہ ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ایک دوسرے کے خلاف اپنی توانائی ضائع کرنے کی بجائے کوئی باوقار صلح کر کے اس توانائی کو اپنے اپنے گھریلو مسائل پر صرف کریں''۔

''میں بھی صلح چاہتا ہوں لیکن دب کر نہیں۔ اگر مجھے دبانے کی کوشش کی گئی تو میں اس تنازعے کو میدان میں ہی حل کرونگا''۔ اس کے لہجے کی کرختگی میری سماعت کو بے حد ناگوار گزری پھر بھی آخری کوشش کے تحت میں نے اپنی شہادت کی انگلی سے اسکی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہنا چاہا کہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ میں اس مسئلے کے حل کے لیے بیحد مخلص اور سنجیدہ ہوں کہ یکلخت ایک بار پھر انگوٹھا میرے اختیار سے باہر ہو گیا اور وہ تمام انگلیوں کو سختی سے دباتا ہوا سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کھلی بے عزتی اور دھمکی پر میرا پڑوسی ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور غصے کی زیادتی سے تھر تھر کانپتا ہوا چیخا۔

''میں تمہیں اس ٹھینگے کا مطلب سمجھاؤنگا۔ میں اپنی اس بے عزتی کا بدلہ بیچ چوراہے پر نہ لیا تو میرے نطفے میں فرق سمجھنا''۔

وہ پاؤں پٹکتا ہوا دروازے کی سمت بڑھا۔ میں نے تیزی سے آواز دیکر اسے روکنا چاہا کہ انگوٹھے وہ حرکت کر بیٹھے جس کا میں نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ دونوں انگوٹھے میرے ہونٹوں پر اس طرح جم گئے کہ میری آواز حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ اور تب مجھے احساس ہوا کہ یہ انگوٹھے حد سے تجاوز کر چکے ہیں اور اب ان کا وجود نا قابل برداشت ہو چکا ہے۔ آج انہوں نے میری آواز کا گلا گھونٹا ہے کل پتہ نہیں...... کسی انجانے خدشے سے میرے رگ و پے میں خوف کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اس سے قبل کہ انہیں اپنی من مانی کرنے کا کوئی اور موقع نصیب ہو میں نے ان سے نجات حاصل کرنے کا پختہ فیصلہ کرلیا۔ میں نے اپنی انگلیوں کی مدد سے انہیں اپنے ہونٹوں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ تھوڑی سی جدو جہد کے بعد انگوٹھے اپنی جگہ سے ہلے اور نیچے کی جانب سرکتے چلے گئے۔ اور اس سے پہلے کہ میں انکی نیت کا ذرا بھی اندازہ کرپاتا وہ میری شہ رگ پر کس گئے۔ میں نے بری طرح چھٹپٹا کر ان کی گرفت سے شہ رگ کو چھڑانا چاہا لیکن ان کا دباؤ بتدریج بڑھتا ہی گیا۔ میری سانسیں رکنے لگیں، آنکھیں باہر کی جانب ابل پڑیں اور بس اب وہ لمحہ آنے ہی والا تھا کہ میری روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے اس آخری پل میرے ڈوبتے ہوئے ذہن میں ایک شدید خواہش ابھری۔

کاش مجھے اتنی سی مہلت مل جائے کہ میں اپنی آنے والی نسل کو ابھی ابھی حاصل ہونے والی یہ آگہی بخش سکوں کہ مانگے کا انگوٹھا بالآخر شہ رگ کو ہی کستا ہے......

☆☆☆☆☆

(خواب کنارے سے)

یہ صفحہ

ہمدردِ ملت، مداحِ رسالت، پیکرِ اخلاص والفت

حاجی محمد ظفر الحق خان

(اناؤں، اتر پردیش)

کے نام

کاش ہمارے درمیان ایسے افراد کی کثرت ہوتی۔